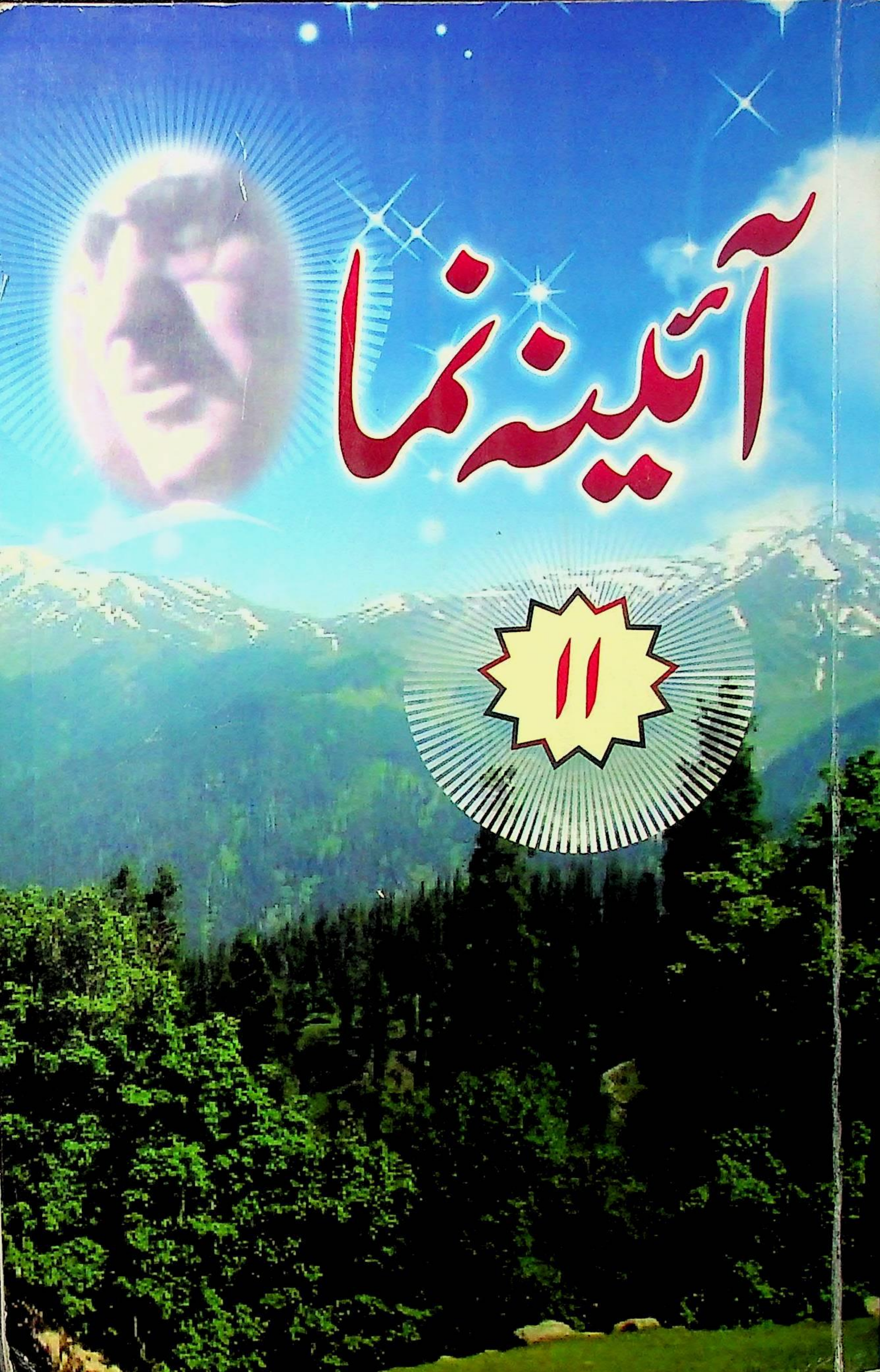
آئینہ نما
۱۱

جُملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب: آئینہ نما

مرتب/ ناشر: قرۃ العین

پتہ: باغات برزلہ، نزدیک بون اینڈ جوئنٹ
ہسپتال برزلہ سرینگر
فون: 2433795/9419015745

کمپیوٹر کمپوزر: سید محمد شفیع
فون:9797101561

سرورق:

سال اشاعت: ۲۰۱۴ء

قیمت: عام ایڈیشن =/300
لائبریری ایڈیشن=/400

☆

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱/	اپنی بات	۵
۲/	غلط فہمی کا ازالہ	۹
۳/	بادشاہ خان کے ساتھ چند لمحے	۱۶
۴/	چراغ بیگ کے قلم سے	۲۵
۵/	بیس سال قبل......بیس سال بعد	۱۰۱
۶/	کیا ہم سب بخشی غلام محمد ہیں	۱۰۸
۷/	رازدان بی اے کے خطوط	۱۲۰
۸/	شیخ صاحب کا گفتار کردار کی روشنی میں	۱۳۷
۹/	ایک خط باتیں ہزار	۱۴۱
۱۰/	عالم ارواح کی ڈاک	۱۴۵
۱۱/	عالم خاک کی ڈاک	۱۶۱
۱۲/	بخشی عبدالرشید کے قلم سے	۱۶۹

۱۳/	جمہوریت میں لاقانونیت	۱۷۷
۱۴/	احمد آباد فسادات	۱۸۰
۱۵/	بُزدلانہ مصلحت پسندی	۱۹۱
۱۶/	یہ انتخاب نہیں انقلاب ہے......	۱۹۴
۱۷/	ماسٹر پلان عُرف خطرناک سازش	۲۰۰
۱۸/	چراغ بیگ کی طرف سے عید مبارک	۲۱۵
۱۹/	کشمیرا کارڈ	۲۱۹
۲۰/	یادوں کی برات خواتین کہاں ہیں؟	۲۲۷
۲۱/	شخصیات	۲۳۴
۲۲/	ایک سال ایک نظر	۲۴۱
۲۳/	شیخ صاحب کی حکومت	۲۴۷
۲۴/	یہ نہیں ہوگا	۲۵۴
۲۵/	بخشی صاحب کا خط شیر کشمیر کے نام	۲۶۱

☆

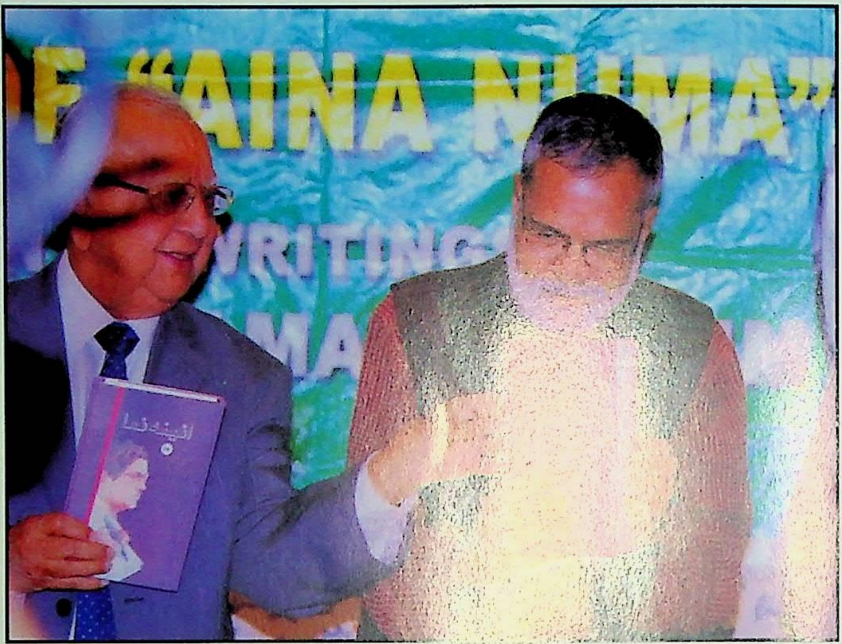

مہمانِ خصوصی کتاب کا اجراء کرتے ہوئے

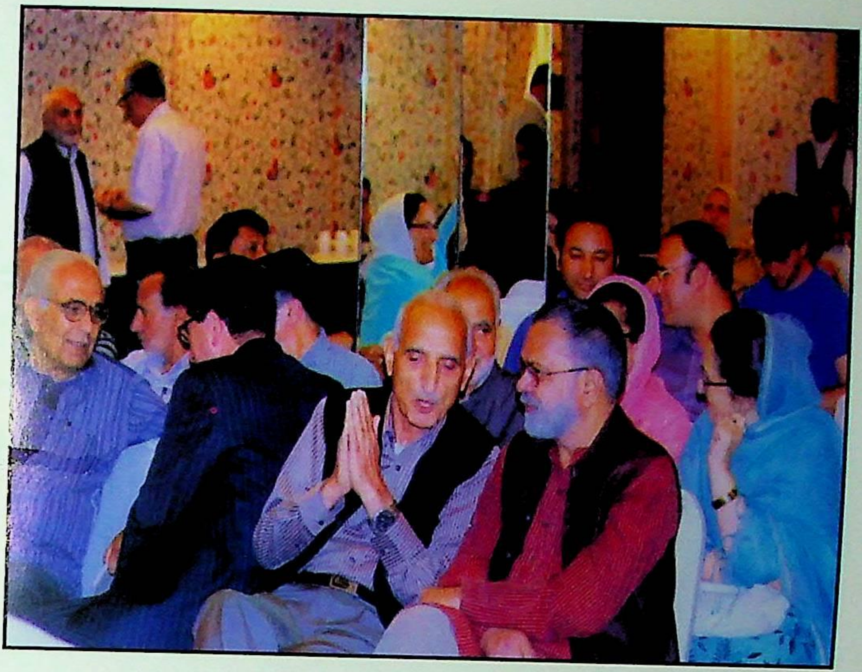

RELEASE OF "AINA NUMA"
COLLECTION OF WRITINGS OF
LATE SHAMIM AHAMAD SHA

قراۃ العین مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے

اپنی بات

'آئینہ نما' کے دس شمارے منظر عام پر آچکے ہیں۔ دسویں شمارے کا اجراء 'آئینہ نما' کے سفر میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور گیارھویں شمارے کا آپ کے ہاتھوں میں ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ آئینہ نما کی اشاعت کو برقرار رکھنے میں میری کوشش اور لگن کے ساتھ آپکا خلوص، تعاون اور اشتراک بھی برابر شامل ہے۔ آئینہ کے ابتدائی برسوں میں تیسرے صفحے کا اہم اور مرکزی کردار چراغ بیگ تھا۔ جو اپنی بیباک اور طنزیہ طرزِ تحریر کی بدولت عوامی سطح پر ایک مقبول ترین کردار تھا۔ حاکمان وقت کے لئے وہ ایک دردِ سر تھا اور ارباب اقتدار اس کے قلم کاٹ اور چبھن سے بے حد پریشان اور خائف تھے۔ ان کا بس چلتا تو اس اذیت کا خاتمہ کر کے ہی دم لیتے۔ ایک لمبے عرصے تک چراغ بیگ تیسرے صفحے پر چھایا رہا اور پوری ذمے داری اور ایمانداری سے اپنے فرائض نبھاتا رہا۔ اسی دوران شمیم صاحب نے چند اور کرداروں کو جنم دیا جن میں ش احمد، کوہکن اور راز داں بی، اے مشہور ہیں۔

تازہ شمارے میں چراغ بیگ ایک بار پھر وارد ہوئے ہیں۔ دراصل

ہفتہ وار آئینہ روزنامے میں تبدیل ہونے کے بعد بھی تیسرا صفحہ جاری رہا۔ اس لئے اس اشاعت میں ان کی شمولیت ناگزیر بن گئی۔ اس کے علاوہ اس میں رازداں۔ بی۔ اے کی تحریروں کو شامل کیا گیا ہے۔ رازداں۔ بی۔ اے نے اہم موضوعات پر تبصرے کئے ہیں اور مختلف سیاسی، سماجی شخصیات کے نام اہم مسائل پر خطوط لکھے ہیں۔

ایک اہم اور تاریخی ملاقات ''بادشاہ خان کے ساتھ چند لمحے'' کے عنوان کے تحت بھی اس شمارے کی زینت ہے بادشاہ خان (جو سرحدی گاندھی کے نام سے بھی مشہور ہیں) کا شمار برصغیر کی اہم اور نامور شخصیات میں ہوتا ہے شمیم صاحب سے اپنی مختصر سی ملاقات میں انہوں نے بڑے بے لاگ اور بے باک طور پر ہندوستانی جمہوریت بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی اور مسلمانوں کے مخدوش اور غیر یقینی مستقبل پر اپنے شدید ردعمل غصے اور مایوسی کا اظہار کیا ہے۔ اُن ہی دِنوں گجرات میں ہوئے فسادات کے بارے میں انہوں نے ارباب اقتدار کو خبردار کرتے ہوئے اس بات کی تنبیہہ کی تھی کہ مجرموں کو ہوا دینے اور ان کی پُشت پناہی کرنے سے ملک انتشار اور سیاسی عدم استحکام کا شکار ہوجائے گا۔ بادشاہ خان نے فسادات سے متاثرہ لوگوں کے لئے قائم کئے گئے کیمپوں کا دورہ کرکے مسلمانوں کی کسمپرسی اور زبوں حالی کو دیکھ کر حکمرانوں کی مجرمانہ غفلت شعاری پر ان کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ یہ بات غور طلب ہے کہ گجرات اپنے فسادات کی وجہ سے آج بھی موضوع بحث بنا ہوا ہے اور یہ خدشہ کہ گجرات فرقہ پرستی کی تجربہ گاہ بنتا جارہا ہے صحیح ثابت

ہو رہا ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور دلچسپ سلسلے کو بھی اس شمارے میں شامل کیا گیا ہے اور وہ ہے عالم بالا اور عالم ارواح کی ڈاک۔ بخشی غلام محمد، خواجہ غلام محمد صادق اور دیگر کئی ممتاز شخصیات کے انتقال کے بعد شمیم صاحب نے بدلتے ہوئے سیاسی اور سماجی پس منظر میں اُن کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کا بیڑا اُٹھایا۔ یہ سلسلہ ان کی زندگی تک جاری رہا اور اسے بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔

بخشی عبدالرشید کا خط (بقلم شمیم صاحب) ان کے دور کی ایک اہم تاریخی دستاویز ہے جو اس دور کی بے ضابطگیوں اور غلط کاریوں کی عکاسی کرتا ہے۔

بہت سے کرم فرماؤں نے 'آئینہ نما' کی باقاعدگی سے اشاعت کو دیکھ کر اپنے پاس رکھے ہوئے آئینہ کے شمارے میرے حوالے کردئے ہیں جس کی بدولت گیارھویں شمارے کی ترتیب میں خاصی مدد ملی۔ ان میں کھلے خط، شخصیات کا خاکہ، چند اہم تبصرے اور مزاحیہ کالم ہیں۔ آپ کا خلوص شامل حال رہا تو انشااللہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

فقط

قرۃ العین

☆

آج کی بات

جن لوگوں کو اہل کشمیر سے یہ شکایت ہے کہ وہ احسان فراموش ہیں عہد شکن ہیں، فرقہ پرست ہیں تنگ نظر ہیں یا شکی مزاج کے ہیں۔ انہیں کشمیر کی پچھلی سترہ سال کی تاریخ کو نہیں بھولنا چاہیے۔ اور میرا ایمان ہے کہ یہاں پچھلے ۱۷ برسوں میں جو کچھ ہوا، ملک کے کسی بھی حصے میں ہوا ہوتا تو وہاں کے لوگوں کے جذبات، ان کا ردِ عمل، رویہ یہاں کے لوگوں سے مختلف نہ ہوتا یہ انتہائی افسوس ناک بات ہے کہ ہندوستان سے کشمیر کی وابستگی کے سترہ سال تشدد، بدنظمی، بدعنوانی، اقربا نوازی اور سیاسی مخالفین کی دارو گیر کی ایک ہولناک کہانی ہے اور ستم ظریفی یہ کہ یہ سب کچھ کشمیر کے ہندوستان سے الحاق کو مضبوط تر بنانے کے لئے ہوا۔

☆

۸/نومبر ۱۹۷۷ء

غلط فہمی کا ازالہ

میں مسلم کانفرنس اور شیخ محمد عبداللہ کا مخالف نہیں ہوں:-

"یہ اشتہار تحریک حریت کے ایک مشہور رہنما مولوی محمد عبداللہ وکیل نے ۱۹۳۴ء میں شائع کیا تھا۔ مولوی صاحب شیخ صاحب کے دست راست ہی نہیں بقول شیخ صاحب ان کے استاد بھی تھے۔ لیکن ۱۹۳۴ء میں ان کے اور شیخ صاحب کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے اور اسی دور میں انہوں نے یہ اشتہار شائع کروایا۔"

"برادران اسلام و برادران وطن اسلام علیکم وتسلیم!

خدارا میرے اِس اشتہار کو غور سے مطالعہ فرمائیں، پھر جو چاہیں نتیجہ نکالیں۔

میں نے آزاد اسمبلی کے سلسلہ میں بذریعہ اعلان صرف اپنا عندیہ ظاہر کر کے ملکی اتحاد کے لئے ایک پروگرام پیش کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر عوام الناس میرے خیالات سے غلط فہمی میں مبتلا ہوں۔ تو کم از کم تعلیم یافتہ لیڈر آسانی سے میرا مطلب سمجھ لینگے۔ مگر افسوس ہے کہ بہت سے تعلیم یافتہ

لیڈر بغیر سوچنے سمجھنے عوام کو مزید غلط فہمی میں ڈالنے کے باعث ہوئے۔

(۱) میں نے اپنے اعلان میں صاف الفاظ میں بتایا ہے۔ کہ دستوری ملوکیت کو قائم کرنا مفید ہے، یعنی قوانین بنانے کا پورا اختیار مجلس کو ہونا چاہیے۔ بشرطیکہ بادشاہ کا اقتدار زائل نہ ہو، اور امریکہ کی طرح بجائی بادشاہ پریزیڈنٹ پیدا نہ ہو۔ اگر لیڈروں کا منشاء بھی یہی ہے۔ تو صاف ظاہر ہے کہ میں نے آزادی کی مخالفت نہیں کی۔

(۲) میں نے صاف تحریر کیا ہے، کہ جمہوریت یعنی کامل سیاسی آزادی یا خود اختیاری حکومت بادشاہ کا اقتدار ہٹا کر اُن لوگوں کو نہیں دینی چاہیے جو اپنی نفسیاتی خواہشات کے بندے ہوں، کیونکہ اس سے ملک سیاسی فسادات اور پارٹی بازیوں میں غرق ہوگا۔ اور یہ میرا خیال ایسا ہے کہ جس کو جلیل القدر علماء سیاست نے تسلیم کیا ہے۔ پس اگر میرے ان صریح الفاظ سے سیاسی لیڈروں نے یا موقر اخبار، ''مارتنڈ'' یا ''ہمدرد'' نے اپنی منشاء کے مطابق غلط نتیجہ نکالا، تو میں اپنے ملک کی ذہنی حالت پر افسوس کا اظہار کرتا ہوں۔

(۳) لاریب میرا ایمان ہے اور شیخ محمد عبداللہ صاحب نے میرے ساتھ گذشتہ تقاریر میں اتفاق فرمایا ہے قرآن کریم کا اعلان ہے، کہ ہر ایک ملک اور قوم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول، اوتار، پیغمبر مبعوث فرمائے جیسا کہ سورہ نحل میں تصریح موجود ہے: کہ تاالله لقدار سلنا انیٰ اھم من تبلاھے اور ان من اصۃٍ الّا خلا نیھا نذیر ہ لہٰذا ایک مسلمان مجبور

ہے کہ تمام اوتاروں اور پیغمبروں کو خدا کا فرستادہ تسلیم کرے، اسی اصول پر میں نے برادران وطن اور دیگر اہل مذہب سے پرآرتھنا کی ہے کہ وہ بھی حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو صادق اور راستباز تسلیم کریں۔ تاکہ مذہبی تعصّبات اور منافرت کا خاتمہ ہو۔ پس یہ خیال ایسا نہیں کہ مجھے گردن زدنی قرار دیا جائے۔

(۴) میں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے، کہ آنحضرت کو صادق مان کر ہندوؤں کا مسجد میں آنا اور مسلمانوں کا مندروں میں جانا اور اپنے طرز پر عبادت الٰہی کرنا اتحاد کے لئے اچھا ہے۔ یہ خیال میں نے اس بناء پر ظاہر کیا کہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بجران کے عیسائیوں کو اپنی مسجد میں گرجا کرنے کی اجازت دی تھی۔

(۵) میرے اعلان میں یہ کوئی بات نہیں کہ ہندو مسلمان آپس میں رشتہ کریں، لیکن اگر برادران وطن اس بات کا اعلان سچائی کے ساتھ کریں۔ کہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی خدا کے اوتار اور رسول ہیں ...... تو کون سی بات باقی رہ جاتی ہے۔ ہندوؤں کا مسلمانوں سے رشتہ کرنا کوئی نئی بات نہیں۔ حضرت اکبر جلال الدین کی زوجیت میں ہندوؤں کی لڑکیاں موجود تھیں مجھے افسوس ہے کہ میری ایسی مسلم تجویز پر نیشنلزم کے علمبردار بھی چلا اٹھے تا انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(۶) یہ محض جھوٹ اور افترا ہے، کہ میں مسلم کانفرنس کا یا شیخ محمد عبداللہ کا مخالف ہوں۔ یا کوئی پروپگنڈا کرتا ہوں، یا کسی شخص کے ساتھ

میری عداوت یا ذاتی رنجش ہے۔ بات صرف اس قدر ہے کہ حضرت شیخ محمد عبداللہ صاحب اپنی تقریروں میں فرماتے رہے ہے، کہ اسلام میں آزادی رائے کا مرتبہ بہت بلند ہے، چنانچہ ایک بوڑھی عورت نے حضرت فاروق اعظمؓ کو دوران تقریر میں ٹوکا تھا اور حضرت عمر فاروق جیسے جلیل القدر انسان نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا تھا۔ اسی اصول پر اگر مجھے کانفرنس یا کانفرنس پارٹی یا کسی لیڈر کے ساتھ اختلاف ہے۔ تو کون سی قیامت بپا ہوگی۔ حالانکہ میں نے قوم کے سامنے کسی اختلاف کے وجوہات ظاہر نہیں کئے۔ کیونکہ اس طرح قومی تباہی کا خوف دامن گیر ہے۔

(۷) یہ درست ہے اور میں تسلیم کرتا ہوں کہ جناب شیخ محمد عبداللہ صاحب کے میرے سر پر بلکہ میری اولاد کی گردن پر بے شمار احسانات ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ شیخ صاحب نے مجھے میدان میں لایا اور خدمت کا موقعہ دیا۔ میرے فرزند عبدالرحیم کو اپنے ساتھ رکھ کر کام کرنے کا شرف بخشا وغیرہ۔ میں ان احسانات کا شکریہ ادا کرتا ہوں مانتا ہوں شیخ صاحب کو خدا جزائے خیر دے، مگر سوال یہ ہے کہ شیخ صاحب کے احسانات کا قومی مسائل میں اور میری آزادی رائے میں کیا تعلق ہے کیا یہی اسلام کی تعلیم ہے کہ قومی مسائل میں یا دینی امور میں ضمیر فروشی اختیار کی جائے۔ شیخ صاحب کو لیڈر نہیں بلکہ معبود بنایا جائے۔ میرے خیال میں مناسب یہ ہے کہ شیخ صاحب لیڈر رہ کر اپنا اقتدار استعمال نہ کریں۔ آزادی رائے اور حریت فکر کو سلب نہ کریں۔ کیونکہ جوش میں آکر پلیٹ فارم پر جذباتی تقریر سے کام لینا خطرناک ہے۔

جبر اور زبردستی ہے۔ اور گوشہ نشین بوڑھوں کو مرعوب کرنے کے لئے کافی ہے
میں شیخ صاحب کی خدمت میں مودبانہ عرض کرتا ہوں کہ آپ خدا کے فضل سے مسلمانوں کے لیڈر ہیں ذرا حضرت خلیفہ اوّل رضؓ کا پہلا خطبہ یاد کریں۔ جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ ''مسلمانو اگر میں ٹیڑھا ہو جاؤں تو مجھے سیدھا کر دینا۔'' احسانات کے زیر بار ہو کر میرے لئے ضمیر کی آزادی کو برباد کرنا مشکل ہے۔ دیکھئے جناب موسیٰ علیہ السلام کو ایک بادشاہ کی طرف سے کہا گیا تھا کہ ''الم ذیک نینا دلید'' ذلشت نینا من عمرن. لیکن جناب موسیٰؑ اظہار صداقت سے نہ رک سکے۔

(۸) یہ بھی محض بے بنیاد بات ہے کہ شیخ صاحب کے ساتھ رہ کر یا کانفرنس کے ساتھ رہ کر میرے ذاتی اغراض پورے ہوئے۔ اور پھر میں علیحدہ ہو گیا۔ اس شبہ کا مختصر جواب یہ ہے کہ میں اس وقت قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے ہوں۔ اور خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے تحریک کشمیر میں کبھی کوئی ذاتی غرض نہ تھی اور نہ اب ہے۔ اگر میں جھوٹ کہتا ہوں۔ تو فلعنۃ اللہ علی الکاذبین موجود ہے۔ اور اگر ٹھنڈے دل سے واقعات پر غور کیا جائے۔ تو صحیفہ فطرت کا ذرہ ذرہ اس الزام کی تردید کرے گا۔

(الف) اگر سرکار نے مسلمانان پنجاب وغیرہ نے تحریک کشمیر میں روپیہ خرچ کیا تو میں بالکل محروم رہا۔

(ب) قومی خدمت کے صلہ میں حکومت کی طرف سے میری حوصلہ افزائی یہ ہوئی کہ مجھے جیل میں ٹھونسا گیا۔ میرے گھر کی تلاشیاں کی گئیں۔

میرا لڑکا عبدالرحیم باوجود ایم-اے-ایل-ایل-بی، ہونے کے ایک سال تک اپنے خرچ پر کام کرتا رہا۔اور پھر مال کے اُمیدواروں سے اس کا نام کاٹا گیا......اوراس کو کسٹم میں ایسی جگہ دی گئی جو معمولی بی اے کے لئے مقرر ہے، حالانکہ معمولی انٹرنس پاس جن کو سرکاری رسوخ تھا۔حد سے زیادہ بڑہائے گئے۔

(ج) میں نے قومی کام کے دوران میں نہ کوئی جائیداد پیدا کی، اور نہ کوئی سرمایہ بنایا۔میری طرف سے ہر ایک شخص کو اختیار ہے کہ وہ میری جائیداد اور آمدنی کی تحقیقات کرے۔

(د) میں نے خواہ مخواہ چکر میں آکر بہت سارو پیہ لگا کر اخبار صداقت میں خسارہ اُٹھایا۔اور پریس میں روپیہ برباد کیا۔

(ذ) اب رہی اسمبلی کی ممبری اس سے محروم رہنے کے لئے میں نے خود سامان تیار کیا۔یعنی شیخ صاحب اور دیگر اراکین کانفرنس سے اختلاف رائے کا اظہار کیا۔یہ خیال تھا کہ کانفرنس کے نظام کی اصلاح ہوگی۔نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو آلۂ کار بنا کر میرے خلاف پروپگنڈا شروع ہوا۔البتہ میری ایک غرض پوری ہوگئی کہ خدا کے فضل سے میرا ایمان محفوظ رہا۔اور قوم سے کوئی غداری نہ کی۔الحمد اللہ رب العلمین اس اشتہار کے خاتمے پر مجھے اخبار ''ہمدرد'' کا پرچہ مورخہ ۹ مئی ۱۹۳۶ء ملا۔جس نے جھوٹ اور افترا پردازی میں انتہائی جرأت دکھائی ہے۔لہٰذا اختصار کے ساتھ میں اس کی شرین کلامی کا جواب عرض کرتا ہوں۔

(ا) میں نے ہرگز مسلمانوں کو جاہل اور نفس پرست نہیں کہا اور نہ موجودہ آزاد اسمبلی پر بحث کی۔ بلکہ میں نے حکومت کی تین صورتیں بتلائیں۔ ایک صورت یہ کہ حکومت دستوری ہو، یعنی مہاراجہ بہادر کے ماتحت مجلس آئین ساز کی مکمل آزادی۔ کیونکہ بادشاہ جس کا مذہب انصاف ہو۔ خدا کی قدر کا نشان ہے دوسری صورت شخصی داستبداری جو کہ بُری ہے۔ تیسری صورت کامل سیاسی آزادی، جیسا کہ امریکہ میں پریذیڈنٹ کا انتخاب ہوتا ہے، اسی صورت کے ساتھ جاہل اور نفس پرست کا تعلق ہے۔ میں نے اس دوسری اور تیسری صورت کی مخالفت کی ہے۔ بس میرے مضمون میں کوئی لفظ ایسا نہیں، جس سے مسلمانوں کی مخالفت ہو، بلکہ اب پہلے سے زیادہ اس بات کا قائل ہوں کہ کشمیر کا مسلمان ہر ایک ترقی کا مستحق ہے۔

اب باوجود اس کے میرے مضمون کو بگاڑ کر مجھے گالیاں دینا اگر اس بات کے لئے ہے کہ اگر مجھے گالیاں دینے سے کسی بھوکے کو روٹی کا ٹکڑا مل جائے گا۔ تو میرا کیا ہرج ہے۔ البتہ خدا کا شکر ہے کہ مجھے قومی خدمات کا صلہ لیڈروں کی مہربانی سے خوب مل رہا ہے۔ زمانہ آرہا ہے کہ جھوٹ کا بیڑا غرق ہوگا۔

☆

میر الڑ کا عبدالرحیم باوجود ایم-اے-ایل-ایل-بی، ہونے کے ایک سال تک اپنے خرچ پر کام کرتا رہا۔ اور پھر مال کے اُمیدواروں سے اس کا نام کاٹا گیا...... اور اس کو کسٹم میں ایسی جگہ دی گئی جو معمولی بی اے کے لئے مقرر ہے، حالانکہ معمولی انٹرنس پاس جن کو سرکاری رسوخ تھا۔ حد سے زیادہ بڑہائے گئے۔

(ج) میں نے قومی کام کے دوران میں نہ کوئی جائیداد پیدا کی، اور نہ کوئی سرمایہ بنایا۔ میری طرف سے ہر ایک شخص کو اختیار ہے کہ وہ میری جائیداد اور آمدنی کی تحقیقات کرے۔

(د) میں نے خواہ مخواہ چکر میں آکر بہت سا روپیہ لگا کر اخبار صداقت میں خسارہ اُٹھایا۔ اور پریس میں روپیہ برباد کیا۔

(ذ) اب رہی اسمبلی کی ممبری اس سے محروم رہنے کے لئے میں نے خود سامان تیار کیا۔ یعنی شیخ صاحب اور دیگر اراکین کانفرنس سے اختلاف رائے کا اظہار کیا۔ یہ خیال تھا کہ کانفرنس کے نظام کی اصلاح ہوگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو آلۂ کار بنا کر میرے خلاف پروپگنڈا شروع ہوا۔ البتہ میری ایک غرض پوری ہوگئی کہ خدا کے فضل سے میرا ایمان محفوظ رہا۔ اور قوم سے کوئی غداری نہ کی۔ الحمد اللہ رب العلمین اس اشتہار کے خاتمے پر مجھے اخبار ''ہمدرد'' کا پرچہ مورخہ ۹ مئی ۱۹۳۶ء ملا۔ جس نے جھوٹ اور افترا پردازی میں انتہائی جرأت دکھائی ہے۔ لہٰذا اختصار کے ساتھ میں اس کی شیرین کلامی کا جواب عرض کرتا ہوں۔

(ا) میں نے ہرگز مسلمانوں کو جاہل اور نفس پرست نہیں کہا اور نہ موجودہ آزاد اسمبلی پر بحث کی۔ بلکہ میں نے حکومت کی تین صورتیں بتلائیں ۔ایک صورت یہ کہ حکومت دستوری ہو، یعنی مہاراجہ بہادر کے ماتحت مجلس آئین ساز کی مکمل آزادی ۔ کیونکہ بادشاہ جس کا مذہب انصاف ہو۔ خدا کی قدر کا نشان ہے دوسری صورت شخصی داستبداری جو کہ بُری ہے ۔ تیسری صورت کامل سیاسی آزادی ، جیسا کہ امریکہ میں پریذیڈنٹ کا انتخاب ہوتا ہے، اسی صورت کے ساتھ جاہل اور نفس پرست کا تعلق ہے۔ میں نے اس دوسری اور تیسری صورت کی مخالفت کی ہے۔ بس میرے مضمون میں کوئی لفظ ایسا نہیں ،جس سے مسلمانوں کی مخالفت ہو، بلکہ اب پہلے سے زیادہ اس بات کا قائل ہوں کہ کشمیر کا مسلمان ہر ایک ترقی کا مستحق ہے۔

اب باوجود اس کے میرے مضمون کو بگاڑ کر مجھے گالیاں دینا اگر اس بات کے لئے ہے کہ اگر مجھے گالیاں دینے سے کسی بھوکے کو روٹی کا ٹکڑا مل جائے گا۔ تو میرا کیا ہرج ہے۔ البتہ خدا کا شکر ہے کہ مجھے قومی خدمات کا صلہ لیڈروں کی مہربانی سے خوب مل رہا ہے۔ زمانہ آرہا ہے کہ جھوٹ کا بیڑا غرق ہو گا۔

☆

۲۲ نومبر ۱۹۶۹ء

بادشاہ خان کے ساتھ چند لمحے

میں نے اتنا باوقار، پُر جلال اور مرعوب کُن چہرہ پہلی بار دیکھا ہے!

بادشاہ خان سے اپنی ۴۵ منٹ کی ملاقات کے بعد بہت دیر تک میرے کانوں میں ان کی آواز گونجتی رہی۔ ان کی شخصیت کے جادو نے مجھے غیر معمولی طور پر متاثر کر دیا تھا، اور خاص طور پر اس چہرے نے، کہ جس کی ساخت میں برسوں کی جدوجہد، ریاضت اور نظر بندی نے اپنا حصہ ادا کیا ہے۔ بادشاہ خان کا چہرہ ان کی پُر جلال اور عظیم شخصیت کا آئینہ ہے اور ان سے پہلی ہی ملاقات کے بعد مجھے یہ اندازہ ہوگیا، کہ انہیں سرحدی گاندھی کیوں کہتے ہیں۔ سادگی، صفائی، صاف گوئی اور بے باکی میں وہ گاندھی جی کے سچے جانشین اور بہترین پیروکار ہیں۔ بادشاہ خان، جامعہ ملیہ میں مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین کے اُس مکان میں رہ رہے ہیں، کہ جس کی ایک ایک اینٹ ذاکر صاحب کی خوش مذاقی، نفاست، سلیقے اور رکھ رکھاؤ کی شہادت دیتی ہے۔ میں شام ۷ بجے کے قریب ان سے ملنے کے لئے گیا، تو وہ ابھی جامعہ نہیں لوٹے تھے۔ سارا دن دلی یونیورسٹی میں گذار کر وہ اب ڈاکٹر سوشیلا نائر کے ہاں گئے تھے۔ وہاں سے ٹیلی فون پر کسی نے اطلاع کر دی، کہ بس آنے ہی

والے ہیں۔ اور کچھ دیر بعد ایک بلند قامت، ضعیف العمر، سفید داڑھی والا ایک دیہاتی کمرے میں داخل ہوگیا۔ دیہاتی کے چہرے پر تھکن کے آثار تھے، اور اس کی وضع قطع سے یہ اندازہ ہو رہا تھا، کہ کہیں بہت دور سے بادشاہ خان سے ملنے کے لئے آیا ہے۔ یہ بادشاہ خان تھے!

مس مردولا سارا بھائی نے بادشاہ خان سے میرا تعارف کرایا اور انہوں نے بڑی شفقت اور محبت کے ساتھ میرا اسلام قبول کرلیا۔ بادشاہ سید ھے اندر گئے، اور کچھ دیر بعد انہوں نے مجھے بُلا لیا۔ سب سے پہلے ان کے مجوزہ کشمیر کے دورے کے متعلق بات چیت ہوئی۔ میں نے بادشاہ خان کو کشمیر کی موجودہ سیاست اور مسائل کے متعلق کچھ بنیادی باتیں بتادیں اور انہیں اس بات سے بھی آگاہ کردیا، کہ ان کے مجوزہ دورے کے تئیں کشمیر کے عوام اور اہل سیاست کا کیا ردِ عمل ہے؟ ”میں ایک بات صاف کرنا چاہتا ہوں، اور وہ یہ کہ میں یہاں پالیٹکس کی غرض سے نہیں آیا ہوں اور میں کشمیر بھی کسی پالیٹکس میں حصہ لینے کے لئے نہیں جا رہا ہوں۔ میں تو لوگوں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں اور اسی غرض سے کشمیر بھی جا رہا ہوں۔ میں سب سے جا کر بات کروں گا، اور جو بھی مجھ سے ملنا چاہے گا، اس سے ملوں گا، میرے وہاں جانے سے کوئی خوش ہوتا ہے یا ناراض، مجھے اس کی بالکل پروا نہیں، میری کوشش صرف یہ ہوگی، کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں سے ملوں، ان کی ہر شکایات سنوں، ان کی مشکلات کا اندازہ کروں“ بادشاہ خان کی آواز رفتہ رفتہ اونچی ہوتی جا رہی تھی۔

”یہ ٹھیک ہے کہ میں یہاں سرکار کا مہمان ہوں، سرکار میرے آنے

جانے، ٹھہرنے کا بندوبست کرتی ہے، لیکن میں جہاں جانا چاہتا ہوں، جاتا ہوں، چاہے سرکار مجھے وہاں لے جانا چاہے یا نہیں؟ میں گجرات کے دورے میں وہاں بھی گیا، جہاں گجرات سرکار مجھے نہیں لے جانا چاہتی تھی'' میرے ایک سوال کے جواب میں بادشاہ خان نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کو ایک بات بتاؤں، کہ میں کسی سے متاثر نہیں ہوتا، میں انگریز سے متاثر نہیں ہوا، پاکستان سے متاثر نہیں ہوا، اور نہ ہندوستان سے متاثر ہوتا ہوں۔ سچائی کی تلاش کا میرا اپنا خاص طریقہ ہے'' بادشاہ خان نے بڑی قطعیت کے ساتھ کہا۔

پھر ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل اور مستقبل کا موضوع چھڑ گیا اور بادشاہ خان نے کہا ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے مستقبل کا خیال نہیں، انہیں اس بات کا بھی صحیح اندازہ نہیں کہ انہیں کتنے سنجیدہ اور نازک مسائل کا سامنا ہے۔ وہ آج بھی چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے آپس میں لڑتے رہتے ہیں۔ ان کے لیڈر، ان کے علماء اور مولوی سب ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں اور ان کی حالت آج بالکل وہی ہے، جو قسطنطنیہ کے عیسائیوں کی اس وقت تھی، کہ جب مسلمانوں نے ان پر حملہ کر کے ان کو مغلوب کر دیا۔ عیسائی لوگ اُس وقت اس بات پر جھگڑ رہے تھے، کہ حضرت عیسیٰؑ نے خمیری روٹی کھائی تھی یا پنیری؟ اور اس طرح کی فروعات میں اُلجھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان بڑی آسانی سے ان پر غالب آ گئے۔ آج اس ملک میں کچھ فرقہ پرست جماعتیں مسلمانوں کو ختم کرنے یا ان کو ملک سے باہر نکالنے کے

لئے منظّم کوششیں کر رہی ہیں اور بہار سے گجرات تک فرقہ وارانہ فسادات کا ایک سلسلہ شروع ہوا ہے۔ ان حالات میں بجائے اس کے کہ مسلمان متفق ہو کر اپنے مستقبل کی فکر کرتے، وہ ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ شیعہ سنی کے جھگڑے ہو رہے ہیں۔ جماعتِ اسلامی، جمعیت العلماء، جمعیت اہلحدیث اور درجنوں دوسری جماعتیں ایک دوسرے سے برسر پیکار ہیں۔"
میں نے ابھی حال ہی میں گجرات کا دورہ کیا اور میں نے اپنی آنکھوں سے وہاں جو تباہی دیکھی ہے۔ اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں" کہ یہ سب کچھ ایک منظّم سازش کے تحت ہوا ہے" بادشاہ خان کی آواز میں ایک ہلکی سی تھرتھراہٹ پیدا ہوگئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ ایک شدید اندرونی کرب کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔

"میں نے وہاں کی سرکار سے کہا" انہوں نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا" کہ مجھے یہاں کے رفیوجی کیمپ دکھاؤ، انہوں نے کہا کہ کیمپ تو خالی ہو گیا ہے، سب لوگ اپنے گھروں کو واپس چلے گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ مجھے خالی کیمپ ہی دکھاؤ۔ مجھے وہاں لے گئے، اور واقعی وہاں کیمپ میں کوئی نہیں تھا۔ وہاں کا مسلمان اتنا بزدل ہے، یا یوں سمجھ لیجئے کہ اتنا سہما ہوا ہے، کہ کسی مسلمان کو یہ جرأت نہیں ہوئی، کہ مجھے صحیح صورت حال بتا دیتا، ایک کمیونسٹ ہندو نے مجھ سے کہا، کہ آپ کو دھوکہ دیا جا رہا ہے۔ مسلمان پناہ گزینوں کو اس کیمپ سے دوسرے کیمپوں میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ میرے ساتھ گجرات سرکار کے دو وزیر تھے، میں نے ان سے کہا کہ آپ لوگ

جائیے، اپنا کام کیجئے، میرے ساتھ کیوں وقت ضائع کرتے ہیں۔ اور اپنے کمیونسٹ دوست سے کہا کہ میرے ساتھ موٹر میں بیٹھو اور پھر ڈرائیور سے کہا کہ جہاں یہ کہے وہاں چلو، کچھ دیر بعد ہم ایک ایسی جگہ پہنچے، جہاں ایک نہیں، دو نہیں، تین نہیں، تقریباً دس پناہ گزین کیمپ تھے اور یہ مصیبت زدہ لوگوں سے بھرے پڑے تھے!'' ''میرا اپنا خیال ہے، کہ گجرات کے فسادات کی ذمہ داری گجرات کی کانگریسی سرکار پر ہے۔ میرے نزدیک گجرات کی حکومت بھی فرقہ پرست ہے اور وہاں کی پولیس بھی، کیونکہ مجھے بتایا گیا کہ پولیس کا رویہ بھی بیحد غیر انسانی تھا، وہاں کے مسلمانوں نے مجھ سے کہا کہ ہندو ہم سے کہتے ہیں، کہ تم یہاں سے چلے جاؤ، اور اگر نہیں جاتے، تو اپنا مذہب اپنی معاشرت چھوڑ دو، میں نے گورنر شریمن نرائن سے کہا، میں یہاں کے نوجوان مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں سے ملنا چاہتا ہوں، مجھے ان سے ملاؤ۔ گورنر نے بہت سے مسلمان نوجوانوں کو بلایا، تو میں نے ان سے کہا کہ تم لوگوں کو یہاں رہنا ہے تم اپنے مستقبل کی فکر کرو، کہ یہاں کیسے رہنا ہے۔ یہ ملک جس طرح ہندو کا ہے اسی طرح آپ کا بھی ہے۔ مردوں نے تو کچھ نہیں کہا، لیکن ایک لڑکی نے کھڑے ہو کر کہا کہ ''بابا! آپ ہم کو کہتے ہیں کہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچو، ہم کیا سوچیں، ہندو ہم سے کہتے ہیں کہ تمہارا سکولوں اور کالجوں میں کیا کام۔ تم کو آج نہیں تو کل یہاں سے جانا ہوگا۔'' جب نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں بھی بے بسی اور بے کسی کا یہ شدید احساس موجود ہو، تو پھر کیا ہو سکتا ہے! اور دیکھنا یہ ہے کہ وہاں کے لیڈروں نے اس

کھوئے ہوئے اعتماد کو بحال کرنے کے لئے کیا کیا ہے! گاندھی جی نے نواکھلی میں گھر گھر جا کر نوجوان لڑکیوں کو یہ حوصلہ دیا تھا، کہ وہ بھاگیں نہیں، اپنی جگہ رہیں۔ وہ جگہ جگہ گھومے تھے۔ اورنہوں نے مصیبت زدوں کے کھوئے ہوئے اعتماد کو بحال کیا تھا۔" اب بادشاہ خان کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔ ایسا معلوم ہورہا تھا، کہ گجرات کے واقعات نے ان کے شعور، احساس اور جذبات کو بُری طرح مجروح کردیا تھا۔ بادشاہ خان کے متعلق میں نے سُنا تھا کہ وہ زیادہ باتیں نہیں کرتے، دوسروں کی بات سنتے رہتے ہیں۔ لیکن احمد آباد کے قتل و غارت نے ضبط وتوازن کے بندھ توڑ دیئے تھے اور وہ ایک شدید روحانی کرب میں مبتلا نظر آرہے تھے۔

"کچھ لوگوں نے شکایت کی ہے، کہ فرقہ وارانہ فسادات کے لئے خود مسلمانوں کا فرقہ پرستانہ رویہ بھی ذمہ دار ہے۔" میں نے احمد آباد کے حالیہ فسادات کے متعلق شری جے، پرکاش نرائن کے مفروضے کے متعلق بادشاہ خان کی کی رائے جاننے کے لئے پوچھا۔

"میں اس بات سے انکار نہیں کرتا، کہ مسلمانوں میں بھی فرقہ پرست لوگ موجود ہیں۔ لیکن میں کہتا ہوں، کہ یہ کہنا غلط ہے کہ یہاں سب مسلمان پاکستانی ہیں، جو پاکستانی ہے یا پاکستان کی مدد کرتا ہے۔ اُس کو پکڑ کر سخت سزا دو، لیکن سب لوگوں کو ایک لاٹھی سے ہانکنا کہاں کا انصاف ہے۔ اور پھر جہاں تک احمد آباد کے حالیہ فسادات کا تعلق ہے یہ بالکل غلط پروپگنڈا ہے کہ وہاں مسلمانوں نے پہل کی، میں خود جگن ناتھ مندر گیا۔ مجھے معلوم ہوا

کہ مندر کے اندر کوئی گیا نہیں۔ اس لئے وہاں نقصان کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ صرف بیرونی گیٹ پر دو ایک شیشے ٹوٹے ہوئے ہیں۔ اور مجھے کچھ لوگوں نے بتایا کہ یہ بھی بعد میں کچھ فسادیوں نے خود ہی توڑے۔ میں نے مندر کے پجاریوں اور مہنتوں سے پوچھا، تو انہوں نے بتایا کہ ہم نہ ہندو ہیں اور نہ مسلمان، ہم تو انسان ہیں۔ ہم ہندو کو بھی کھانا دیتے ہیں اور مسلمان کو بھی۔ ہر سال ہمارا جلوس نکلتا ہے۔ کبھی کسی مسلمان نے ہمیں ٹیڑھی آنکھ سے نہیں دیکھا۔ لیکن اس سال ایک معمولی سے واقعہ پر بہانہ بنا کر قتل و غارت اور لوٹ مار کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ احمد آباد کے حالیہ واقعات کے متعلق اسی طرح بہت سا جھوٹا پروپگنڈا کیا گیا ہے۔ میں سیوا گرام پہنچا، تو وہاں مجھ سے لوگوں نے پوچھا، کہ کیا یہ صحیح ہے کہ احمد آباد میں مسلمانوں نے ہندو لڑکیوں کو اغوا کیا۔ اور ہندو عورتوں کی چھاتیاں کاٹیں۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ مسلمان یہ جرأت کہاں سے لاتے کہ ہندو کو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھے۔ ہاں ہندو مسلمان لڑکیوں کو لے بھاگے اور مسلمان عورتوں کی بے حرمتی کی۔ پولیس تین دن تک تماشا دیکھتی رہی۔ اور جب پھر حرکت میں آگئی، تو جتنا اور لوگوں نے نہیں مارا تھا۔ اس سے زیادہ پولیس نے مسلمانوں کو مارا میں کہتا ہوں یہ کیسی سیکولر حکومت ہے اور کیسا سیکولرازم ہے۔''

پرسوں پریذیڈنٹ مسٹر گری میرے پاس یہاں آئے تھے۔ میں نے ان سے بھی یہ کہا کہ یہ کیسی صورت حال ہے۔ کہ آج بائیس برس بعد بھی یہاں اس قسم کے فسادات ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آپ بتائیے کہ کیا

کیا جاسکتا ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرا علاج یہ ہے کہ بدمعاش کو سزا ملنی چاہیے۔ چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان۔ میں نے یہی بات پرائم منسٹر سے بھی کہی۔ میں نے کہا کہ گجرات میں ہزاروں آدمی مرے۔ کیا ایک آدمی کو بھی پھانسی کی سزا ملی۔ پرائم منسٹر نے کہا، کہ قانون میں ایسی کمزوری ہے، کہ مجرم کو پکڑا نہیں جاسکتا۔ میں نے کہا، کہ قانون دنیا کو دکھانے کے لئے تو نہیں ہوتا، مجرم کو سزا دینے کے لئے ہوتا ہے۔ اگر مجرم قانون کے سہارے بچ جاتا ہے، تو ایسے قانون کو بدل دینا چاہئے۔ میں کہتا ہوں کہ اسی وجہ سے قاتلوں اور فسادیوں کے حوصلے بڑھ جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں، کہ مارو، کوئی پوچھنے والا نہیں، لیکن اگر ہر قاتل کو یہ یقین ہو جائے کہ اس کے جرم کے سزا پھانسی ہوگی، تو وہ قتل کرنے سے پہلے پچاس مرتبہ سوچے گا۔

''اس کے برعکس مسلمان اتنا بزدل اور خودغرض ہے، کہ میرے پاس ایک ڈپٹی منسٹر آئے، انہوں نے کہا کہ میں تو سٹیشن پر صرف مسلمان ریفیوجیوں کو دیکھنے گیا تھا اور یہ سب لوگ میرے برخلاف ہو گئے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کو نکال دو۔ میں نے اس کو بتایا، کہ اگر تم ڈپٹی منسٹر ہو کر بھی حق کی بات نہیں کہہ سکتے، تو کیا تم اس ڈپٹی منسٹری کو چاٹو گے!''

''میں نے سُنا ہے کہ وہاں کشمیر میں کسی لیڈر نے یہ تقریر کی تھی کہ مسلمانوں کا یہاں کیا کام، وہ یہاں سے چلے جائیں۔ یہ لوگ یہ نہیں کہتے، کہ صادق یہاں رہے اور شیخ عبداللہ یہاں سے چلا جائے۔ یا آپ رہیے کہ آپ اسمبلی کے ممبر ہیں۔ یہ تو یہ کہتے ہیں کہ مسلمان چلا جائے اور میری سمجھ

میں نہیں آتا کہ حکومت ایسے لوگوں کو، ایسی جماعتوں کو یہ باتیں کہنے کی اجازت کیوں دیتی ہے۔ مسلمانوں نے مجھ سے شکایت کی کہ اگر وہ کوئی تنظیم بناتے ہیں تو حکومت ان سے کہتی ہے، کہ یہ کمیونل جماعت ہے، لیکن حکومت سے کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ آر، ایس، ایس اور دوسری جماعتیں کیا ہیں۔''

بادشاہ خان اب پورے جلال میں آچکے تھے، وہ باتیں کرتے ہوئے اب ہاتھ بھی ہلانے لگے تھے، اور مجھے یقین ہے کہ اگر بہن جی (مس مردولا سارا بھائی) انہیں یہ یاد نہ دلاتیں، کہ ان کے کھانے کا وقت ہو گیا ہے، تو اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے بہت کچھ کہتے۔ احمد آباد نے ان کے مزاج اور اُن کی پوری شخصیت کو متاثر کر دیا ہے۔ ان کا بس چلتا تو وہ گاندھی جی کی طرح گھر گھر جا کر ان بدنصیب لوگوں کے زخموں پر مرہم رکھتے کہ جن کا جرم صرف یہ ہے، کہ ان کا مذہب دوسروں سے مختلف ہے۔

بادشاہ خان مجھے چھوڑنے کے لئے باہر آئے۔ باہر والے کمرے میں میری بچی صبا اور میری بہن حوا میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے بادشاہ خان سے کہا کہ یہ میری بچی صبا ہے، انہوں نے صبا کو گود میں اُٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا، لیکن وہ سہم کر بھاگ گئی۔ بادشاہ خان نے خالص پٹھانی لہجے میں کہا:

''یہ کیسی بچی ہے جو ہم سے ڈرتی ہے'' ہم باہر آئے تو صبا نے پوچھا ''پاپا! یہ کابلی والا تھا!'' ''ہاں بیٹا یہ کابلی والا ہے'' میں نے جواب دیا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ بادشاہ خان ٹیگور کے کابلی والا سے بے حد مشابہ ہیں۔

☆

۲۱ مئی ۱۹۶۵ء

تیسرا صفحہ

چراغ بیگ کے قلم سے

عوام کے نام :-

پیارے عوام ! تمہاری سخت جانی پر مکمل اعتماد رکھتے ہوئے اُمید کرتا ہوں کہ تم باوجود آلامِ روزگار، چرخ کج رفتار اور ''عنایات'' پرورگار کے بخیر و عافیت ہوگئے۔ تمہاری خیریت اور عافیت سے بڑے بڑے لوگوں کی توقعات وابستہ ہیں اس لئے خدا کرے کہ تمہاری ہڈی پسلی اور سادہ لوحی صحت وسلامت رہے۔ کئی دنوں سے تمہیں خط لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا، لیکن ''خواص پسند'' طبیعت کو تم سے مخاطب ہونا گوارا نہ تھا، بڑی مشکلوں سے آج اسے اس گناہ بے لذّت پر آمادہ کیا ہے اُمید ہی نہیں بلکہ یقین واثق ہے کہ میرا یہ خط پڑھنے کے باوجود تمہاری جہالت، لاعلمی، تعصب، حماقت اور شرافت میں کوئی فرق واقع نہ ہوگا اور تم حسب دستور پٹتے رہو گے اور اُف بھی نہ کرو گے۔ خدا تمہیں اپنی حماقت کا بوجھ اُٹھانے اور اپنے رہنماؤں کی قسمت سنوارنے کی مزید توفیق عطا کرے۔ بھولے بھالے عوام! تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے مدقوق چہروں پر صدیوں سے جو گرد جمع ہوئی ہے یہ کہاں سے آتی ہے؟ تمہیں کبھی اس بات کا احساس ہوا ہے کہ تمہاری بے نور

آنکھوں کی بینائی کہاں گئی ہے؟ تمہیں کبھی یہ سوچنے کی فرصت ملی ہے کہ تمہاری پیٹھ پر زخموں کے جو نشان ہیں یہ کس کی دین ہے، تم نے کبھی اپنے ضمیر سے یہ پوچھنے کی زحمت گوارا کی ہے کہ تم کیا ہو؟ تمہارے وجود کی اصلیت اور تمہاری زندگی کی حیثیت کیا ہے۔ تم نے کبھی اپنے رہبروں اور اپنے رہنماؤں سے یہ سوال کیا ہے کہ ہماری منزل کیا ہے تم کہ جو وفاداری، قربانی اور عقیدت کے نام پر موت کو بھی گلے لگاتے ہو۔ کبھی یہ بھی سوچتے ہو کہ ان الفاظ کے معنی کیا ہیں اور تم سے وفاداریوں کا مطالبہ کیوں کیا جاتا ہے؟ اگر تم میں ایک بار بھی یہ سوالات پوچھنے کی ہمت پیدا ہو جائے تو یقین کرلو کہ تم ''عوام'' کی پست سطح سے اُٹھ کر خواص کی بلندیوں کو چھونے لگو گے اور پھر دنیا میں عوام اور خواص کا فرق مٹ جائے گا لیکن یہ تمہاری بد قسمتی اور تمہارے رہبروں کی خوش قسمتی ہے کہ تم نے صدیوں سے اس قسم کا کوئی سوال نہیں پوچھا ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم آئندہ بھی نہیں پوچھو گے، حالاں کہ تمہارے ایک سوال سے تاریخ کا دھارا بدل سکتا ہے تمہاری خاموشی، تمہارے ایثار اور تمہارے صبر سے لیڈروں کی عزت، عظمت اور سیرت وابستہ ہے۔

پیدائشی احمقو! تم نے کبھی یہ سوچا ہے کہ ہر سیاسی لیڈر صرف تمہارے نام کی تجارت کیوں کرتا ہے؟ تمہاری محبت میں کیوں گرفتار ہے تمہارے ہی لئے اپنی راتوں کی نیندیں حرام کیوں کرتا ہے تمہاری ہی خاطر جیل کیوں جاتا ہے تمہارے ہی بھلے کے لئے اپنے نازک کندھوں پر وزارت عظمیٰ کا بوجھ

کیوں لادے پھرتا ہے؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تمہاری خاطر شیخ صاحب کوڈے کنال میں اپنی صحت بنا رہے ہوں اور تمہارے ہی غم میں صادق صاحب بھی دُبلے ہورہے ہوں ۔ یہ کیوں کر ہوسکتا ہے کہ تمہارے ہی عشق میں بخشی صاحب بھی لاکھوں کی جائیداد بنائیں اور خواجہ عبدالصمد پنڈت بھی، یہ کیسی عجیب بات ہے کہ جب بھی کسی کو کوئی بے ایمانی کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو وہ تمہارا نام لے کر اس کا آغاز کرتا ہے، ہر سیاسی جماعت کا دعویٰ ہے کہ وہ تمہاری نمائندہ جماعت ہے۔ ملک کا ہر سیاسی لیڈر تمہارے غم میں موٹاپے کا شکار ہورہا ہے تمہارا نام لے کر اقتدار حاصل کیا جاتا ہے اور پھر اس اقتدار کو تمہاری ''مرمت'' کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور جب کبھی اقتدار خطرے میں پڑ جاتا ہے تو پھر تمہارے کمزور حافظے پر اعتماد کر کے تمہیں بے وقوف بنایا جاتا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں تمہارے نام پر ہندوستان سے الحاق کیا گیا اس وقت اس الحاق کو کشمیر کے چالیس لاکھ عوام (ایک کم نہ ایک زیادہ) کی حمایت حاصل تھی ۱۹۵۳ء میں عوام ہی کے نام پر اسی الحاق کی تنسیخ کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ یہ بخشی صاحب کا دعویٰ تھا کہ تم اُن کے ساتھ ہو، صادق صاحب کو یہ حسن ظن تھا کہ تم ان کے ساتھ ہو۔ شیخ صاحب کی رہائی کے بعد پرانی غلط فہمیاں دور ہوگئیں لیکن نئی غلط فہمیاں پیدا ہوگئیں اب مولوی فاروق کا دعویٰ ہے کہ وہ اور صرف وہی ''عوام'' کے نمائندے ہیں۔ محاذ رائے شماری کا دعویٰ ہے کہ ریاست کے سبھی بالغ اور نابالغ بے شعور اور باشعور لوگ اس تنظیم سے وابستہ ہیں۔ پولٹیکل کانفرنس نام کی ایک جماعت جس کی

ساری ممبرشپ کانفرنس کے دفتر میں سما سکتی ہے کا دعویٰ ہے کہ وہی یہاں کے عوام کی نمائندہ کہلانے کی مستحق ہے کانگریس کے چیف آف دی سٹاف میجر جنرل قاسم نے اعلان کیا ہے کہ کانگریس چپکے سے لوگوں کے دلوں میں گھر کرگئی ہے اور عوامی نمائندگی کا حق صرف اسی جماعت کو حاصل ہے، مجلس عمل کی ایک مرتب جماعت جو مجلس زیادہ اور عمل کم ہے بھی اُمیدواروں کی فہرست میں ہے۔غرض یہ کہ تمہارے نام پر بڑے بڑے سٹے باز اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لئے میدان عمل میں ہیں ان سب جماعتوں اور لیڈروں میں ہزاروں اختلافات ہیں لیکن ان میں ایک قدر شترک ہے اور وہ ہے تمہاری حماقت پر مکمل اعتماد...... یہ سب رہنمایان قوم اور غازیان دین تم سے یہ نعرے لگوائیں گے یہ ملک ہمارا ہے اس کا فیصلہ ہم کریں گے، لیکن جب فیصلے کا وقت آئے گا، تو ان کا نعرہ یہ ہوگا......

''یہ ملک تمہارا ہے اس کی فیصلہ ہم کریں گی۔'' یہ کسی نجومی کی پیشن گوئی نہیں، چراغ بیگ کا دعویٰ ہے اور اس کی بنیاد پچھلے دس برسوں کی تاریخ ہے۔

میرے پیارو!:۔

اپنے ذہن کے اندھیروں میں روشنی کی ایک کرن داخل کر سکتے ہو؟ اپنے مردہ شعور کو احساس کا ایک انجکشن دے کر زندہ کر سکتے ہو......؟ اپنی ننگی پیٹھوں پر کھاتے ہوئے زخموں کو زبان دے سکتے ہو؟ یہ اگر کر سکتے ہو تو آزادی کا سورج تمہاری جہالت، ذلت اور رسوائیوں کی پستیوں سے اُبھر کر تمہارے مستقبل کو روشن کرے گا۔تم دنیا کے بدترین غلام ہو اس لئے کہ تمہارا

ذہن غلام ہے تمہاری فکر اور تمہاری سوچ کو سلب کر دیا گیا ہے۔ زندہ باد اور مردہ باد کے نعرے بلند کرتے کرتے تمہارے ذہنوں کو زنگ لگ چکا ہے تم گراما فون کے ایک گھسے پٹے ریکارڈ ہو جس کے اندر کسی دوسرے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ تم ''خام مواد'' ہو جسے تم سے زیادہ سمجھ دار لوگ اپنے آرام و آزمائش کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ تمہارا خون پسینہ تاج محل کی تعمیر میں صرف ہوتا ہے جس میں کوئی شاہ جہاں اپنی ممتاز محل کو دفن کر دیتا ہے اور پھر تمہیں اس کے اندر داخلہ بھی نہیں ملتا تمہارے نام پر حکومتیں بنتی ہیں اور پھر یہ حکومتیں تمہارا کچومر نکال دیتی ہیں تمہارے پیسے سے تمہارے لئے سیکریٹریوں کی فلک بوس عمارتیں بنتی ہیں اور ان کے گیٹ پر ایک دربان مقرر کیا جاتا ہے جو تمہیں اندر جانے سے روک دے تمہارے نام سے ہسپتال بنتے ہیں لیکن یہاں تمہارا علاج نہیں ہو سکتا۔ تمہارے نام سے سکول اور کالج قائم کئے جاتے ہیں اور پھر یہاں تمہارے بچوں کو داخلہ نہیں ملتا...... تمہاری بھلائی کے لئے تم پر مظالم توڑے جاتے ہیں اور تمہاری ہی بھلے کی خاطر اپنے بچوں کو ولایت بھیجا جاتا ہے...... زندہ باد کے نعرے لگانے سے کسی وقت فرصت ملے تو میری ان باتوں پر غور کرنا۔ تمہارا چراغ بیگ آئینہ

۱۵/ اگست ۱۹۶۵ء

نظام عدلیہ :-

انسانی تہذیب اور تمدن کے ارتقاء کی سب سے بڑی نشانی ہمارا موجودہ نظام عدلیہ ہے، جذبات کی تہذیب خواہشات کی تنظیم اور فرد کے

حقوق کا تحفظ کرنے کے لئے انسانی دفاع اپنے ماحول اور تجربات کی روشنی میں جو بہتر سے بہتر نظام وضع کرسکتا تھا اسے عدلیہ کا نام دیا گیا اور اس کے ساتھ تقدس وطہارت کا وہ تصور وابستہ کیا گیا کہ سیاسی اقدار کی پامالی اور عسکری قوتوں کے عروج کے باوجود اس کا بنیادی ڈھانچہ جوں کا توں ہے لیکن اس دور کی سب سے بڑی ستم ظریفی ملاحظہ کیجئے کہ تہذیبِ انسان کا یہ سب سے قابل فخر ادارہ جو عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے وجود میں آیا تھا۔ آج عدل وانصاف کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اور ناانصافی وعدم مساوات کی سب سے بڑی یادگار ہے۔ عدل وانصاف کے معیار وضع کرنے میں انسانی سرشت اور حیوانی خواہشات کو مدنظر رکھا گیا تھا اور اس بات کی کوشش کی گئی تھی کہ کوئی خطاکار اپنی جزاء وسزا سے بچ نہ پائے اور کسی بے گناہ کو اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا نہ بھگتنا پڑے ان مقاصد کے حصول کے لئے قانون اور عدالتی ضابطوں کا ایک پیچیدہ نظام وجود میں آیا، جس میں ناانصافی غلطی اور ہوئے امکانات کو کم سے کم امکانی سطح تک لانے پر زور دیا گیا لیکن یہ نظام زلف یار کی طرح اتنا خمدار اور پیچ دار بن گیا کہ انصاف کی ترازو اسی پیچ وخم میں گرفتار ہوکر رہ گئی اب عدالتوں کے لئے عالیشان عمارتیں تعمیر ہورہی ہیں، قانون اور ضابطہ ہائے دیوانی وفوجداری کی کتابوں سے لائبریریاں بھری پڑی ہیں، انصاف اور حقوق کے تحفظ کے لئے ایک سے بڑھ کر ایک وکیل موجود ہے لیکن اس کے باوجود ہمارے عدالتی نظام سے لوگوں کا اعتماد اور ہماری کتابوں سے ان کا اعتقاد اُٹھتا

جارہا ہے انصاف اور عدل کے ان عظیم الشان اداروں سے کچھ ایسے ناگوار تصورات منسوب ہوگئے ہیں کہ ہمارے معاشرے اور ہماری اخلاقیات میں ایک شدید بحران پیدا ہوگیا ہے اور سب سے تکلیف دہ بات یہ ہے کہ ہم یہ سب کچھ جانتے ہوئے اپنے آپ کو بے بس پا رہے ہیں کیوں کہ نظام عدلیہ میں اس بحران کی ذمہ داری افراد پر نہیں ۔اس نظام پر ہے، جسے وضع کرنے میں اور اس منزل تک پہنچانے میں صدیوں کے انسانی تجربات کا نچوڑ صرف ہوا ہے۔ یہ نظام بلندیں انسانی خواہشات کا مظہر ہوتے ہوئے بھی عملی طور نا مکتفی اور ناکارہ ثابت ہوا ہے۔ انصاف کی مسندوں پر بیٹھے ہوئے منصف شدید خواہشات کے باوجود اکثر اوقات انصاف وضع نہیں کر پاتے ، کیوں کہ ان کا ضمیر، ان کا ذہن اور اُن کی قوتِ فیصلہ قواعد وضوابطہ کی زنجیروں کی پابند ہے۔

ثبوت جرم کے لئے جو کم سے کم معیار مقرر ہیں انہیں انسان کی کجروی نے اخفائے اور اعانت مجرم کا سب سے بڑا وسیلہ بنادیا ہے پولیس کی ''نوازشوں'' سے بے گناہی جرم اور جرم بے گناہی میں بدل گئی ہے۔ انصاف کا محل شب ہجر سے بھی زیادہ صبر آزما ہے وکیلوں کی کرم فرمائی سے روح کی بجائے جسم کو اہلیت حاصل ہوگئی ہے، مختلف عدالتی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اتنی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے کہ عدل وانصاف کے یہ ادارے غریبوں کی پہنچ سے باہر ہیں۔

مقدمات کی سماعت اور پیروی کی رفتار اتنی مدہم اور سست رفتار ہے کہ

اوسطاً ہر مقدمے کے فیصلے میں کم از کم ۳ سال لگتے ہیں نچلی سطح پر رشوت ستانی اور بدعنوانیوں کا اتنا زور ہے کہ غالباً کسی اور محکمے میں نہ ہوگا۔ ججوں کی تعداد اتنی کم اور مقدمات کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ جج صاحبان کے لئے انصاف کرنا عملی طور ناممکن بن گیا ہے قانونی ضابطوں کا سہارا لے کر مقدمات کو طول دینے کے نئے نئے گُر ایجاد ہوتے ہیں۔ انصاف کی تلاش میں آنے والا کوئی بھولا، بھٹکا جب ایک بار عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے تو پھر اُس کے لئے ان بھول بھلیوں سے باہر آنا ناممکن بن جاتا ہے اس لئے ہمارے ہاں اکثر دوست واحباب اور عزیز اں کے لئے یہ دعا کی جاتی ہے کہ خدایا انہیں عدالت کے دروازے کا منہ نہ دکھا۔ عدالتوں کے احاطوں میں آپ نے غریب، مفلوک الحال پژمردہ اور بے روح جسموں کو انصاف کی تلاش میں مارے مارے پھرتا دیکھا ہوگا۔ ان کی بے نور آنکھوں میں یقین کی روشنی نہیں مایوسی کے اندھیرے نظر آئیں گے۔ یہ عدالت کے چپراسی، نقل نویس اور کلرک سے اس طرح ڈرتے ہیں۔ جیسے وہ محکمہ انصاف کا ملازم نہیں بلکہ عزرائیل کی انسانی شکل ہوان کے تجربات نے ان پر یہ بات ثابت کردی ہے کہ صرف حق بات کہنے سے انہیں انصاف حاصل نہ ہو سکے گا۔ اس لئے اپنے جائز حقوق کی حفاظت اور حصول کے لئے بھی اکثر انہیں غلط واقعات کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ قانون کو چکمہ دینے کے لئے قانونی موشگافیوں کی پناہ ڈھونڈنا پڑتی ہے غرض قانون اور انصاف کی چھاؤں میں سب سے زیادہ لاقانونی اور ناانصافی پرورش پاتی ہے اور ہم ''پابند رسوم و قیود'' انسانیت کے

اس رقصِ بسمل کو دیکھ رہے ہیں۔ منصف ضابطے کی زنجیروں میں پا بہ جولاں ہے ملزم اس ضابطے کا اسیر ہے اور مجرم اسی ضابطے کا سہارا لے کر آزاد ہے یہ انسانی تہذیب کا عجز ہے یا انسانی کردار کا المیہ، ہم کچھ نہیں کہہ سکتے، لیکن ایک بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ہمارا موجودہ عدلیہ ایک ایسے نظام کا کھنڈر ہے جو کبھی عظیم رہا ہوگا، لیکن جس طرح کوئی کھنڈر رہائش اور اقامت کی ضرورتوں کے لئے استعمال نہیں ہوسکتا اسی طرح یہ بوسیدہ نظام دورِ حاضر کے تقاضوں کو پورا نہیں کرسکتا جب تک اس میں بنیادی تبدیلیاں پیدا نہ کی جائیں یہ عدل وانصاف کی بجائے ظلم اور ناانصافی کا سب سے بڑا اور موثر ذریعہ بنا رہے گا۔

☆

۷ مئی ۱۹۶۵ء

۲

لارنس نے اپنی کتاب ''ویلی آف کشمیر'' میں ایک جگہ لکھا ہے کہ جو لوگ اہل کشمیر کے کردار اُن کی عادات اور سماجی برائیوں کو نمایاں طور پیش کر کے یہاں کے لوگوں کے متعلق فتویٰ صادر کرتے ہیں انہیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ دنیا کی کوئی قوم اگر اس ظلم و ستم اور استحصال و استبدادی کی شکار ہو جائے جو کئی صدیوں سے اہل کشمیر کا مقدر رہا ہے تو اُس میں اس قسم کی بُرائیوں کا پیدا ہونا ناگزیر ہے لارنس نے یہ بات آج سے ۶۵ سال پہلے کہی تھی، لیکن میرا خیال ہے کہ یہ آج کے کشمیر کے متعلق بھی بالکل صحیح ہے جن لوگوں کو اہل کشمیر سے یہ شکایت ہے کہ وہ احسان فراموش ہیں عہد شکن ہیں۔ فرقہ پرست ہیں تنگ نظر ہیں یا شکی مزاج کے ہیں۔ انہیں کشمیر کی پچھلی سترہ سال کی تاریخ کو نہیں بھولنا چاہیے۔ اور میرا ایمان ہے کہ یہاں پچھلے ۱۷ برسوں میں جو کچھ ہوا، ملک کے کسی بھی حصے میں ہوا ہوتا تو وہاں کے لوگوں کے جذبات، ان کا ردِ عمل، رویہ یہاں کے لوگوں سے مختلف نہ ہوتا یہ انتہائی افسوس ناک بات ہے کہ ہندوستان سے کشمیر کی وابستگی کے سترہ سال تشدد،

بدنظمی ، بدعنوانی ، اقربا نوازی اور سیاسی مخالفین کی دار و گیر کی ایک ہولناک کہانی ہے اور ستم ظریفی یہ کہ یہ سب کچھ کشمیر کے ہندوستان سے الحاق کو مضبوط تر بنانے کے لئے ہوا۔'

۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۳ء کا زمانہ اقتصادی بدحالی اور سیاسی مخالفین کے خلاف غیر معمولی تشدد کا دور ہے۔ پاکستانی حملے نے یہاں کی معشیت کو برباد کر کے رکھ دیا تھا، غیر یقینی صورتحال کے پیش نظر تجارت اور کاروبار کو فروغ حاصل نہ ہوسکا زرعی اصلاحات پیداوار میں اضافے کی بجائے کمی کا باعث بن گئیں، سیاحوں کی آمدورفت بھی کچھ یوں ہی سی رہی۔ نتیجے کے طور پر ایک معاشی بحران کی سی کیفیت پیدا ہوگئی سیاسی محاذ پر نیشنل کانفرنس قیادت نے عوام کا اعتماد حاصل کرنے کی بجائے عوام کے خلاف لڑنا شروع کر دیا ہند کشمیر الحاق کو فکری اور نظریاتی ''مواد'' دینے کی بجائے اسے ایک جذباتی ردعمل کا روپ دیا گیا اپنے سیاسی مخالفین کو دلائل اور منطق سے قائل کرنے کی بجائے پابندِ سلاسل کر دیا گیا۔ تحریر و تقریر پر اتنی زبردست پابندیاں عائد کر دی گئیں کہ چاروں طرف قبرستاں کی سی خاموشی چھا گئی ، بہت سے لوگوں کو زبردستی اپنے گھر چھوڑ نے پر مجبور کر دیا گیا زمینیں اور جائیدادیں ضبط کر دی گئیں اختلاف رائے کو سب سے بڑا جرم قرار دیا گیا۔ غرض یہ کہ سیاسی مخالفین کو کچلنے کے لئے ہر وہ حربہ استعمال کیا گیا۔ جو حکومت کے محدود ذرائع کے حد امکان میں تھا اس قسم کی تشددانہ پالیسیوں کا منطقی نتیجہ حکومت کے خلاف زبردست نفرت اور مزاحمت کے روپ میں نمایاں ہونا شروع ہو گیا اور چونکہ ریاستی عوام

کواس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ ظلم وتشدد اور جبر وتشدد کا یہ سارا سلسلہ مرکزی حکومت کے ایماء اس کی مرضی اور منشاء کے عین مطابق ہے اس لئے شیخ صاحب کی گرفتاری کے بعد وہی اس نفرت، بیزاری کی وارث بن گئی۔

۱۹۵۳ء کے بعد بخشی غلام محمد نے اپنے پیشروؤں کی پالیسی کو ایک نظام زندگی کا درجہ عطا کیا انہوں نے شاعرانہ انصاف Poetic Justic کے اصولوں کو مدنظر رکھ کر شیخ صاحب اور ان کے ساتھیوں کے خلاف تشدد اور دار و گیر کے وہی نسخے آزمائے جو وہ اپنے مخالفوں کے خلاف استعمال کر چکے تھے بلکہ اپنے ذہن کی خلاقی اور طبیعت کی خدمت نے انہیں کچھ مزید تجربے کرنے پر بھی اُکسایا، پورے دس سال تک انہوں نے کشمیر کو سیاسی کورپشن اور اقربا نوازی کے لئے ایک تجربہ گاہ کے طور پر استعمال کیا اور دلچسپ بات یہ ہے کہ تجربے کے تمام تر اخراجات حکومت ہند نے برداشت کیے۔ بخشی غلام محمد کے خلاف رشوت ستانی، اقربا نوازی اور بدعنوانی کے درجنوں الزامات کی تحقیقات کے لئے آہنگر کمیشن مصروف عمل ہے اس لئے میں ان تفصیلات کا ذکر نہیں کروں گا اور اس سلسلے میں کمیشن کے فیصلے کا انتظار کروں گا لیکن بخشی صاحب کے اس نا قابل معافی جرم کا ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا جس کے خلاف کوئی کمیشن اور کوئی تحقیقاتی عدالت قائم نہیں کی جائیگی۔

بخشی غلام محمد نے ہندوستان سے کروڑوں روپیہ وصول کر کے اپنے لئے اور اپنے بھائی بندوں کے لئے جائیدادیں بنائیں مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں انہوں نے اپنے سیاسی مخالفین کو کچل کر جی حضوریوں کو اپنا اعتماد

بخشا اس کے لئے بھی اسے معاف کیا جاسکتا ہے انہیں ریاست کی خوشحالی سے زیادہ اپنے خاندان کی خوشحالی عزیز تھی، یہ بات بھی سمجھ میں آسکتی ہے اوراس کو بھی نظر انداز کیا جاسکتا ہے، لیکن جس طرح انہوں نے پوری قوم کو کرپٹ کرنے کی کوشش کی تاریخ میں اس کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں انہوں نے خزانۂ عامرہ کوصرف اپنے مفاد کے لئے ہی استعمال نہیں کیا،قومی اخلاق اورقومی کردار کومسخ کرنے کے لئے بھی استعمال کیا وہ کشمیریوں سے ان کی شرافت نفس،قوت ارادی اورقوت فیصلہ چھیننا چاہتے تھے اوراس کے لئے انہوں نے تشدد کا ہی استعمال نہ کیا (وہ تو ہر ڈکٹیٹر کرتا ہے) بلکہ سیم وزر کا بھی فیاضانہ استعمال کیا، ان کے دور میں شرافت،صداقت، دیانتداری، اصول پرستی اوراخلاق سے ہمارااعتماد واعتقاد اُٹھ گیا تھا۔

پچھلے ۱۷ برسوں میں جونئی نسل وجود میں آئی ہے ان کے لئے بخشی غلام محمد طاقت وراوراقتدار کی ہی نہیں، تقدیر اور جبریت کے بھی سمبل تھے، محنت، ریاضت اور دیانت بڑی بے معنی اصطلاحات ہوکررہ گئی تھیں اوربخشی غلام محمد کی خوشنودی، کامیابی و کامرانی کا واحد معیار۔ سیاسی زندگی کی بدعنوانیاں بخشی صاحب کے نظام زندگی کا جزوقالب تھیں اوریہی بدعنوانیاں ہمارے نظام فکر کا ایک حصہ بن گئیں تھیں اور میرے نزدیک بخشی غلام محمد کا سب سے بڑا جرم یہی تھا کہ اُنہوں نے صرف اپنے ذاتی مفاداوراقتدار کے لئے پوری قوم کے کردار کومسخ کرنے کی کوشش کی اور مجھے یہ کہتے ہوئے بڑی سخت ذہنی کوفت ہورہی ہے کہ اُنہیں بہت حدتک اپنے مقصد میں کامیابی

ہوئی......اور ہاں یہ سب کچھ ہند کشمیر الحاق کو مضبوط سے مضبوط بنانے کے لئے ہوا اور مرکزی سرکار کی اعانت سے ہوا یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ سرگباشی جواہر لال نہرو کشمیر کی اندرونی حالت سے واقف نہ تھے؟ یہ کیوں کر ہوسکتا ہے کہ مرکزی سرکار کو بخشی غلام محمد کی ''کارکردگی'' کی علمیت نہ تھی؟ یہ کیسے مان لوں کہ کانگریسی لیڈروں کو بخشی صاحب کی ''مقبولیت'' کا صحیح اندازہ نہیں تھا اس بات کی کیا توجیہہ ہوسکتی ہے کہ ہندوستانی پریس نے پورے دس سال تک ملک کشمیر کے زخموں سے رِستی ہوئی پیپ سے بے خبر رکھا، میری نگاہوں میں یہ تغافل شعاری نہیں، تجاہل عارفانہ تھا، جواہر لال نہرو سب کچھ جانتے ہوئے بھی خاموش رہے مرکزی سرکار جانتے ہوئے بھی انجان بنی رہی۔ کانگریسی لیڈر وقتاً فوقتاً بخشی صاحب کی حوصلہ افزائی کرتے رہے ہندوستانی پریس دانستہ یا نادانستہ طور پر خاموشی کی اُس سازش میں شریک رہا جو ہندوستان کے نادان دوستوں نے کشمیر کو جہنم زار بنانے کے لئے منظّم کی تھی اس سازش کا سب سے المناک پہلو یہ ہے کہ کشمیر اور ہندوستان کا سب سے بڑا محسن دنیا کا عظیم مفکر اور سیاستدان جواہر لال نہرو شعوری یا غیر شعوری طور پر اس ڈرامے کا ایک اہم کردار تھا۔

دس برس کے بعد بھی اگر بخشی غلام محمد کامراجی چوہے دان میں نہ پھنستے تو خود ان کے کہنے کے مطابق وہ آج چوتھے پنج سالہ پلان کی جڑیں کاٹنے میں مصروف ہوتے۔ وہ آج ٹھاکر روگناتھ سنگھ کی زبان میں ''خالد ہند'' سے ''خالد ایشیا'' ہوگئے ہوتے! آج بخشی غلام محمد کیخلاف الزامات کی تحقیقات

کے لئے کمیشن مقرر کرنا بہت آسان بات ہے، لیکن اُس وقت، جب کشمیر کی رُوح تڑپ رہی تھی۔ جب اس کے زخموں سے پیپ بہہ رہی تھی جب یہاں شریفوں کی عزت اور عصمت لٹ رہی تھی، جب ہندوستانیوں کے خون پسینے کی کمائی ہمارے کردار اور اخلاق مسخ کرنے کے لئے صرف ہو رہی تھی، ہندوستان کا آئین، اس کا انصاف اور اس کی غیرت کہاں سوئی ہوتی تھی؟ بخشی غلام محمد کے خلاف قائم کردہ تحقیقاتی کمیشن کے فیصلے کا اطلاق بخشی غلام محمد پر ہی نہیں، مرکزی سرکار اور کانگریسی قیادت کے اُن تمام ''منصوبہ سازوں''، پر ہوگا۔ جن کی خاموشی کو نیم رضار سمجھ کر بخشی صاحب نے وہ سب کچھ کیا جس کے لئے وہ آج مورِدِ الزام ہیں، ان تمام دلخراش واقعات کا ذکر کر کے میں، کسی نئی حقیقت کا انکشاف نہیں کر رہا ہوں، بلکہ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہندوستانی حکومت اور لیڈروں نے پچھلے ۱۷ برسوں میں یہاں کے عوام کو بھی قابل اعتبار نہیں سمجھا۔ وہ ہمیشہ افراد کو اقتدار سونپ کر اپنے فرائض اور اپنی ذمہ داریوں سے غافل رہے انہیں یہ بتایا گیا ہے کہ کشمیری یا تو سستے چاولوں سے زیر کئے جاسکتے ہیں یا ڈنڈے کے زور سے! اور چونکہ کشمیر میں ظلم وستم اور جبر واستبداد کا ہر تیر ہند کشمیر الحاق کے نام پر چلایا گیا ہے اس لئے یہاں کے لوگوں کو جائز طور پر ملک کے حکمرانوں کی نیت اور ان کے خلوص پر شبہ ہو گیا ہے اور یہی وہ شبہ ہے جس کا شکار مدراس، بنگال اور پنجاب کے لوگ ہیں آپ جس طرح مدراس کے لوگوں کو مطمئن کرنا چاہتے ہیں اسی طرح کشمیر کے لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کیجیے، آپ جس طرح بنگالیوں

کی بات سنتے ہیں ہماری بات بھی سن لیجیے۔ آپ جس طرح ناگالینڈ کے لوگوں کو شبہات دور کرنے کے لئے کوشاں ہیں اسی طرح ہمارے شبہات دور کرنے کی کوشش کیجیے!

پچھلے ۷۱ برسوں میں یہاں ہندوستان کی جو Image پیش ہوئی ہے وہ اتنی جاذب نظر نہیں کہ اُسے دیکھ کر کوئی اُس پر عاشق ہو جائے۔ یہ اتنی کریہہ المنظر اور ناگوار ہے کہ اسے دیکھ کر گھن آتی ہے اور اگر ہمیں یہ تصویر پسند نہیں تو ہمارے ذوقِ جمال کو قصوروار ٹھہرانے کی بجائے اس تصویر کو بہتر بنایئے۔

ہندوستان اور کشمیر کے الحاق پر زور دینا فضول ہے جو لوگ ایمانداری سے اس تعلق کو قبول کر چکے ہیں انہیں ''اٹوٹ انگ'' کی رٹ لگانے کے بجائے، اس متعلق کو مضبوط بنانا چاہئے اس سلسلے میں ہم سستے چاولوں کا تجربہ بھی کر چکے ہیں اور گولیوں کا بھی۔ یہ دونوں نسخے اس تعلق کو مضبوط بنانے کی بجائے اسے کمزور کرتے ہیں، اس لئے ہمیں کسی تیسرے نسخے کی تلاش کرنا ہوگی۔

☆

۱۳ مئی ۱۹۶۹ء

۳

افلاطون سے لے کر غازی عبدالرحمان تک جمہوریت کا سفر انسانی ذہن کی خلاقی، تنوع پسندی اور تجربہ کاری کی داستان ہے۔ ہر دور اور ہر ملک میں جمہوریت کی نئی نئی تعریفیں وجود میں آتی ہیں اور جمہوریت چوں کہ ایک متحرک اور فعال تصور ہے، اس لئے ہر ملک اپنی ضرورت کے مطابق ''جمہوریت کا کوٹ'' سِلواتا ہے کوئی اس کا اوور کوٹ بناتا ہے کوئی شارٹ کورٹ، کوئی شیروانی، بعض ممالک نے اس کا پاجامہ بنانا بھی شروع کر دیا ہے، برطانوی جمہوریت کو اب تک مثالی جمہوریت مانا جاتا تھا، لیکن اب امریکہ کا دعویٰ ہے کہ امریکی جمہوریت بھی کچھ کم جمہوری نہیں ہے اور بعض لحاظ سے امریکی جمہوریت برطانوی جمہوریت سے افضل ہے، روسی جمہوریت کی ایک نئی تفسیر ہے، یہ تفسیر کارخانوں میں تیار ہوتی ہے اور بند ڈبوں میں عوام تک پہنچائی جاتی ہے، ہندوستانی جمہوریت اور پاکستانی جمہوریت نے بھی جمہوری نظام میں کچھ دلچسپ تجربے کئے ہیں، ہندوستان چونکہ ایک رجعت پسند پسماندہ ملک ہے اس لئے وہ برطانوی جمہوریت کی نقل ہی اُڑاتا رہا ہے، لیکن پاکستانی جمہوریت نے جمہوریت کے روایتی

تصور سے بغاوت کر کے دنیا کو ایک نئی جمہوریت کا سبق پڑھایا ہے یعنی بنیادی جمہوریت جو بنیادی زیادہ اور جمہوریت کم ہے۔ اہل کشمیر بھی ۱۹۴۷ء سے جمہوریت کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر رہے ہیں اور حتیٰ الامکان اور حتی المقدور جمہوریت کے محدود تصور کو لامحدود کرنے میں اپنا حصہ ادا کرتے آئے ہیں آج ہم بڑے فخر اور اعتماد کے ساتھ اس بات کا دعویٰ کر سکتے ہیں کہ برطانیہ روس اور امریکہ کی طرح ہم نے بھی اپنے ہاں ایک "مخصوص جمہوریت" کے کلاسیکی تصور کو ایک نیا رنگ اور روپ بخشا ہے ہم نے اپنے ہاں جمہوریت کی ان تمام خامیوں کو دور کر دیا ہے جو اس نظام کو گھن کی طرح کھائے جا رہی ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے جمہوریت کی تعریف اِن الفاظ میں کی تھی۔

جمہوریت ایک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تو لا نہیں کرتے

اہل کشمیر نے بندوں کی اس "گنتی" کو تضیع اوقات قرار دے کر آئینِ جمہوریت میں مناسب اور موزوں ترمیمیں کر دیں۔ ترمیموں اور تبدیلیوں کا یہ عمل ۱۹۴۷ء سے لے کر آج تک برابر جاری ہے اور جمہوریت کے سب سے بڑے علمبردار بخشی غلام محمد کی گرفتاری اسی عمل کا تسلسل ہے "خالص کشمیری جمہوریت" کا سب سے پہلا تجربہ شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی رہنمائی میں کیا گیا تھا، جب ۱۹۵۱ء میں آئین ساز اسمبلی کے انتخابات ہوئے تھے کشمیری چونکہ حساب میں کمزور واقع ہوئے ہیں اس لئے رہنماؤں نے

بندوں کو ''گننے'' کے بجائے اُنہیں ''چننے'' پر ہی اکتفا کی۔ اسمبلی میں ۷۵ کے ۷۵ ممبران بلا مقابلہ کامیاب ہو گئے یا یوں کہیئے کہ بلا مقابلہ چن لئے گئے۔ کشمیریوں کو اگر جمہوریت کا کوئی تجربہ نہیں تھا لیکن انہوں نے جس آسانی سے ۷۵ ممبروں کا ''چناؤ'' کیا۔ اس سے جمہوریت کے روشن مستقبل کے امکانات روشن تر ہو گئے اور جب سے اب تک ہم برابر جمہوریت کی بلندیوں کی طرف پرواز کر رہے ہیں۔ کشمیری عوام نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ برطانوی اور امریکی عوام سے بھی زیادہ تربیت یافتہ شعور رکھتے ہیں کہ ایک ہی نگاہ میں پورے ۷۵ ممبران کو چن لیتے ہیں اور اس طرح ہم نے اقبال کی تعریف میں یہ تحریف کر دی۔

جمہوریت ایک طرز حکومت ہے جس میں کوئی لیڈر بندوں کو ''چُنا'' کرتا ہے تولا نہیں کرتا۔

۱۹۵۳ء میں ہمیں جمہوریت کا یہ نظام بھی فرسودہ نظر آیا اور ہم نے اپنی ضروریات کے مطابق اس میں مزید ترامیم کرنے کا پروگرام بنایا ہمیں محسوس ہوا کہ جمہوریت کو ہم نے عوام کی دستبرد سے تو بچا لیا ہے لیکن اب یہ جمہوری روایات کی اسیر ہو کر رہ گئی ہے اس لئے ہم نے جمہوری قاعدوں اور کُلیوں کا گلا گھونٹ کر اس ''نمائندہ'' اسمبلی کے لیڈر کو گرفتار کر کے اسے ''نمائندہ تر'' بنا دیا اور پھر اسی اسمبلی کے گرفتار شدہ لیڈر کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ پاس کروایا، برطانوی اور امریکی ماہرین جمہوریت ہماری اس برق رفتاری کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے، ہم نے خالد کشمیر کی قیادت میں تین

سال میں ہی جمہوریت کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا جو کام انگریزوں سے ابھی تک نہیں ہوسکا ہے ہم نے اُسے چٹکیوں میں انجام دیا۔ فضا خالد کشمیر زندہ باد کے نعروں سے گونجنے لگی اور کشمیری جمہوریت کا دوسرا دور شروع ہوگیا یہ دور ''خالص کشمیری جمہوریت'' کا زریں دور ہے اس میں جمہوریت کی تمام پامال روایات کو ترک کر کے ان کی جگہ نئی روایتیں قائم ہوئیں، بے مقصد اور بے معنی طریق کار کو بدل کر نئے قواعد وضوابط وضع کیے گئے جمہوریت کے عوامی تصور کو جمہوریت کی روح کے لئے خطرناک قرار دے کر اسے خاندانی جمہوریت کی سطح پر لایا گیا۔ یعنی اب ریاست میں ایک خاندان کی جمہوریت قائم ہوگئی، ممبران اسمبلی کو ملک اور قوم کی بجائے ایک فرد اور ایک خاندان کے مفادات کی نگرانی پر مامور کیا گیا، ممبروں کی حیثیت زرخرید غلاموں کی سی ہوگئی۔ جو اپنے آقا کے اشاروں پر ''اُٹھک بیٹھک'' کرنے لگے۔ خالد کشمیر نے شیر کشمیر کی منتخب کردہ اسمبلی کو شیر کشمیر ہی کے خلاف استعمال کر کے جمہوریت کو ایک نئی معنویت عطا کر دی۔ ممالک غیر سے ماہرین ہمارے جمہوری نظام کا شہرہ سن سن کر یہاں آنے لگے۔ ۱۹۵۷ء میں نئے انتخابات ہوئے اور جمہوریت کی نئی قدریں بھی وجود میں آگئیں۔ ممبران کی اکثریت تو حسب دستور سابقہ بلا مقابلہ کامیاب ہوگئی۔ لیکن کہیں کہیں جمہوریت کی آبرو رکھنے کے لئے مقابلوں کا اہتمام بھی کیا گیا۔ لیکن یہ مقابلے مخالف اُمیدواروں کے لئے دعوت شوق سے زیادہ تازیانہ عبرت ثابت ہوئے کسی کی ہڈی پسلی توڑ دی گئی اور کسی کو اغوا کیا گیا، جس کی ہڈی

پسلی نہ ٹوٹ سکی یا جو اغوا نہ ہو سکا اُس کے پاؤں میں روٹ پرمٹ کی بیڑیاں ڈالی گئیں، چُن چُن کر جاہل اور گندہ ناتراشیدہ قسم کے افراد سے ایوان اسمبلی کو مزین کر دیا گیا۔ اس اسمبلی کے متعلق ایک دلچسپ لطیفہ یہ سننے میں آیا ہے کہ ایک ایسے حضرت کو ممبر چُنا گیا تھا جنہیں یہ معلوم ہی نہ تھا کہ اسمبلی کے ممبران کو ماہوار مشاہراہ بھی ملتا ہے، جن حضرت نے سفارش کر کے ان کو ممبر ''لگوایا'' تھا۔ وہ پورے دو سال تک ان کی تنخواہ بھی وصول کرتے رہے۔ دو سال بعد اتفاقاً اُن پر یہ راز کھلا کہ ''منابرین'' کو ماہوار تین سو روپیہ ملتے ہیں یہ روایت ایک ایسے ممبر سے منسوب ہے جو موجودہ اسمبلی کے بھی رکن ہیں۔ اور جنہوں نے حال ہی میں عدم اعتماد کی تحریک پر دستخط بھی کئے تھے۔ بہر کیف یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ چراغ بیگ کہنا یہ چاہتا ہے کہ اپنے ہاں کشمیری جمہوریت کا بڑا بول بالا رہا اور اقبالؔ کے شعر میں ایک بار پھر تحریف کی ضرورت محسوس ہوئی۔

جمہوریت ایک طرز حکومت ہے جس میں کہ حکومت ممبر تو چُنا کرتی ہے، پوچھا نہیں کرتی۔

نہ عوام سے پوچھا جاتا ہے نہ خود ممبروں سے پوچھا جاتا ہے بعض ممبروں کا کہنا ہے کہ انہیں کامیاب قرار دیئے جانے کے بعد بذریعہ ڈاک یہ اطلاع موصول ہوئی کہ وہ ممبر اسمبلی ہو گئے ہیں ان ہی انتخابات میں بیسویں صدی کے مشہور پارلمینٹرین بخشی عبدالرشید بھی بلا مقابلہ کامیاب ہو گئے تھے۔ رشید صاحب ان دنوں ہند پارلیمنٹ کے ممبر ہیں اور انہوں نے ملک

بھر میں اپنی خاموشی کی وہ دھاک بٹھا دی ہے کہ اب جمہوریت کی تعریف بھی بدل گئی اور اب بقول چراغ بیگ

جمہوریت ایک طرز ہے جس میں کوئی ان پڑھ ممبر تو بنا کرتا ہے، بولا نہیں کرتا۔

آج کشمیری جمہوریت کا سب سے بڑا علمبردار اپنی قائم کی ہوئی رَوایات کا شکار ہو کر تارانو اس جیل میں محبوس ہے خواجہ غلام محمد صادق بھی اپنے پیشروؤں کے تیار کردہ نسخوں کو تیر بہدف سمجھ کر ان کی اہمیت اور افادیت کے قائل ہونے لگے ہیں۔ بخشی غلام محمد کی گرفتاری کشمیری جمہوریت کے عین مطابق ہے اور چراغ بیگ کو یقین ہے کہ صادق صاحب ان روایات کے تحفظ کے لئے اپنی کوشش جاری رکھیں گے۔ اس وقت کشمیری جمہوریت کی تعریف اس سے بہتر الفاظ میں ممکن نہیں ہوسکتی۔

جمہوریت اِک طرفہ تماشا ہے کہ جس میں
ہر دشمنِ جان رونقِ زندان بنے گا

☆

۱۷/اکتوبر۱۹۶۴ء

۴

برٹینڈ رسل نے اپنی خودنوشت سوانح میں لکھا ہے کہ ''طاقت (اقتدار) کی ایک خوبی یہ ہے کہ اسے حاصل کرنے کے بعد انسان وہی کچھ کرتا ہے جس کے خلاف جدوجہد کرتے کرتے اسے اقتدار حاصل ہو جاتا ہے۔'' صادق صاحب اوران کے رفقاء پچھلے گیارہ برسوں سے آزادئ تحریر و تقریر کے علمبردار رہے ہیں۔ یہ آزادی حاصل کرنے کے لئے انہیں کئی بار اقتدار سے محروم ہونا پڑا۔ اور کئی مرتبہ خود انہوں نے اقتدار کو ٹھکرا دیا۔ وزیر اعظم ہونے کے بعد انہیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ تحریر و تقریر کی آزادی کے بغیر ریاست میں کسی صحت مند فکری تحریک کا اُبھرنا ممکن نہیں۔

اس لئے انہوں نے تحریر و تقریر پر عائد شدہ تعزیریں ہٹا دیں۔ زبانوں کے تالے چونکہ سترہ برس بعد کھل گئے تھے اس لئے بڑا شوروغل مچ گیا۔ اپنی سترہ سالہ خموشی کی تلافی کرنے کے لئے بعض لوگوں نے چیخنا شروع کیا۔ تقریر کی گرم بازاری کا یہ عالم تھا کہ ہر ''سامع'' مقرر ہو گیا اور تقریر سننے کے لئے ''حاضرین'' کا ہاتھ لگنا (چراغ بیگ کی اصطلاح میں

پھنسنا'') مشکل ہوگیا۔ اخبارات کے ''شجر ممنوعہ'' کو بھی مدتوں بعد عوام الناس پر حلال کردیا گیا۔ اس لئے اخبارات کا سیلاب اپنی پوری شدت کے ساتھ عوام پر نازل ہوا۔ سیلاب کی سطح روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سطح خطرے کے نشان سے اوپر ہوگئی ہے اور اب ''غرقابی'' کا خطرہ ہے۔

اتنے اخبارات نکل آئے ہیں کہ اگر آئندہ تین مہینوں میں بھی یہی رفتار رہی تو تین مہینے کے اختتام پر ہر ''قاری'' ایڈیٹر بن چکا ہوگا۔ بعض '' ناگواریوں'' کے باوجود یہ صورت حال صحت مند، حوصلہ افزا اور اطمینان بخش ہے، لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نئی سرکار اپنے کیئے پر پچھتا رہی ہو، اور کسی ''گناہ'' کے شدید احساس سے دبی ہوئی ہو۔ آزادیٔ تحریر وتقریر کی یہ گرم بازاریاں اسے ناگوار گذری ہوں اور وہ اپنے ''فیصلے'' پر نظر ثانی کر رہی ہو۔ روزنامہ ''کشمیر پوسٹ'' اور روزنامہ ''مارتنڈ'' کے ایڈیٹروں کی گرفتاری کی اور کوئی معقول توجیہہ نہیں کی جاسکتی۔ چراغ بیگ دونوں اخبارات کی پالیسی سے سخت بیزار ہے۔ اور معمولی سے واقعہ کو فرقہ وارانہ رنگت دینے کی اس کی کوشش کو بھی ناپسند کرتا ہے۔ جس کی پاداش میں ایڈیٹروں کو گرفتار کیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود وہ اس گرفتاری کو حکومت کی بوکھلاہٹ اور تنگ نظری کا اشتہار سمجھتا ہے۔ ان گرفتاریوں کے لئے حکومت کے پاس کوئی معقول جواز نہیں۔ تحریر وتقریر کی آزادی بھیک نہیں ہے جو فیاض حکومت نے ہمارے کشکول میں ڈال دی ہو۔ یہ ہمارا پیدائشی حق ہے اور اس پیدائشی حق کو اس

آسانی کے ساتھ ہم سے چھین لینا ارباب حکومت کے برخود غلط ہونے کا واضح ثبوت ہے۔ ''کشمیر پوسٹ''اور ''مارتنڈ'' کے ساتھ ہمارے لاکھ اختلافات ہوں، لیکن ان کی آزادی پر حملہ ہماری آزادی پر حملہ ہے۔ ڈیفنس آف انڈیا رولز کی جو تلوار آج ان کی گردن پر پڑی ہے وہ کل ہماری گردن کو بھی آزماسکتی ہے۔ ''کشمیر پوسٹ'' اور ''مارتنڈ'' پر تعزیریں عائد کر کے حکومت نے برٹینڈ رسل کے اس بیان کی تصدیق کر دی ہے کہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد آدمی وہی کچھ کرتا ہے جسے وہ اس سے پہلے ناپسند کرتا ہو۔ اگر حکومت دیانتداری سے صحافتی معیار اور صحافتی دیانت کی ضمانت بننا چاہتی ہے۔ تو اُسے چھوٹی چھوٹی انتقام گیریوں کی سطح سے بلند ہو کر اپنی وسیع القلبی اور روشن ضمیری کا ثبوت دینا ہوگا۔ حکومت کا قانون ''کشمیر پوسٹ'' اور ''مارتنڈ'' کی معمولی سی فروگذاشت پر جلال میں آسکتا ہے۔ اس لئے کہ دو فرقوں میں منافرت پھیلنے کا احتمال ہے۔ لیکن حکومت کا قانون دہلی سے شائع ہونے والے ایک انگریزی چیتھڑے ''انڈین آبزرور'' کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کرسکتا۔ یہ اخبار پچھلے کئی مہینوں سے ہزاروں کی تعداد میں یہاں بِک رہا ہے۔ یہ اخبار ہمارے نوجوانوں کے اخلاق، ہمارے گھروں کی عزت، ہماری بہو بیٹیوں کی عصمت اور ہمارے معاشرے کی صالح قدروں کو پامال کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ سستی رومانیت، فحش نگاری اور غلیظ صحافت کا علمبردار چیتھڑا سرینگر کے بازاروں میں ہزاروں کی تعداد میں بِک رہا ہے۔ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی ایک پوری نسل اس کے چنگل میں پھنس کر اپنے

اخلاق اور اپنی شرافت سے بے بنیاد ہوتی جارہی ہے۔ صحافت کے نام پر ہمارے سماج کی اعلیٰ قدروں کی بیخ کنی ہو رہی ہے۔ ہماری شاندار تہذیبی روایات پامال ہورہی ہیں۔ عزت اور شرافت کے مسلمات کا مذاق اُڑایا جارہا ہے۔ لیکن اس چیتھڑے کے خلاف ہمارا قانون حرکت میں نہیں آسکتا۔ اس کے لئے کوئی قید، کوئی پابندی نہیں ہے۔ وہ نوجوانوں کے اخلاق پر ڈاکہ ڈال کر ہم سب سے کچھ چھین کر اپنے لئے محل بنا سکتا ہے۔ لیکن ملک کا قانون خاموش تماشائی بن کر یہ سب کچھ گوارا کرے گا۔ مرکزی وزیر داخلہ شری نندہ سداچار سمتی کے سہارے ملک سے رشوت ستانی ختم کرنا چاہتے ہیں، لیکن ان کی قیام گاہ سے صرف کچھ دور ننگِ صحافت ''انڈین آبزرور'' اخلاق، شرافت اور تہذیب کی دھجیاں اُڑا رہا ہے۔ کیا ریاستی وزیر داخلہ کسی قانون کا سہارا لے کر اس چیتھڑے کا داخلہ ریاست میں بند نہیں کر سکتے؟ یہ چیتھڑا یہاں جو غلاظت پھیلا رہا ہے۔ وہ اس منافرت سے کہیں زیادہ مہلک ہے جس کے پھیلانے کے الزام میں ''کشمیر پوسٹ'' اور ''مارتنڈ'' کے ایڈیٹر محبوس ہیں۔

چراغ بیگ ریاست کے تمام سنجیدہ حلقوں سے گذارش کرتا ہے کہ وہ قانونی کارروائی کا انتظار کئے بغیر اس مخرب اخلاق اور ننگِ صحافت چیتھڑے کے خلاف منظّم ہو جائیں۔ اپنے گھروں کو اس غلاظت سے محفوظ رکھنے کے لئے اپنے بچوں کو اس خطرے سے آگاہ کریں۔ ریاست میں اس کا داخلہ بند کرانے کے لئے حکومت پر دباؤ ڈالیں اور جب تک اس چیتھڑے کا داخلہ

بند نہ کیا جائے تب تک اطمینان سے نہ بیٹھیں۔ یہ اخلاق، شرافت، تہذیب اور صحافت کی قدروں کے تحفظ کا سوال ہے اور اس جنگ میں ہر اس انسان کو شریک ہونا چاہیے جسے یہ قدریں عزیز ہیں۔

چراغ بیگ کو معلوم ہوا ہے کہ حکومت وقت نے آبادی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لئے کچھ اہم اسکیموں پر عمل درآمد شروع کر دیا ہے ۔ایک سکیم کے اعتبار سے تمام بازاری ڈاکٹروں اور ادویات بیچنے والے کمپونڈروں کو رجسٹرڈ پریکٹی شنرس کا درجہ دیا گیا ہے۔اب ہر کمپونڈر کو قانون نے مریضوں کا کام تمام کرنے کا حق دیا ہے۔ چراغ بیگ کا خیال ہے ان نیم حکیموں کے تعاون اور اشتراک سے بہت جلد بڑھتی ہوئی آبادی کا پریشان کن مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اب چونکہ حکومت نے کمپونڈ روں اور بازاری ڈاکٹروں کو سند یافتہ ڈاکٹروں کا درجہ دیا ہے۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ شہر کے قصائیوں اور نائیوں کو بھی سرجنوں کا درجہ دیا جائے اور ممکن ہو تو وکیلوں کے ایجنٹوں کو بھی ہائی کورٹ میں وکالت کرنے کی اجازت دی جائے۔

جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے!

☆

نومبر ۱۹۶۵ء

۵

کولھو کا بیل اپنی جگہ پر پھر واپس آ گیا ہے دو سال پہلے صادق سرکار نے لبرلائزیشن کا جو تجربہ شروع کیا تھا، وہ ناکامیوں اور نامرادیوں کا بوجھ لئے بہ صد حسرت و یاس تجربہ گاہ سے اپنی اصلی قیام گاہ کی طرف جا رہا ہے۔ اب کی بار وہ لوگ بھی ''اندر'' ہیں جو پہلے کبھی نہ تھے۔ صورت حال نے اتنا بڑا پلٹا کھایا ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سُنا افسانہ تھا...... اس صورت حال سے اگر کوئی طبقہ یا گروہ خوش ہے تو وہ ہے بخشی غلام محمد اور اُن کے ساتھی۔ جو زیرِ لب مُسکراتے ہوئے طنزیہ انداز میں یہ کہتے ہوئے سُنے جاتے ہیں۔ اور دو شہری آزادیاں...... ''اب جب کہ شہری آزادیاں مرحوم ہو چکی ہیں اور ان کی تجہیز و تکفین کے انتظامات بھی مکمل کئے جا چکے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بڑی دیانتداری اور لاتعلقی سے ان حالات، واقعات اور شخصیات کا جائزہ لیا جائے جن کی وجہ سے اتنا بڑا تاریخی تجربہ ناکام رہا۔

میں آج بھی بلا کسی تامل کے اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ دو سال پہلے خواجہ غلام محمد صادق نے وزارت عظمیٰ کا قلمدان سنبھال کر شہری آزادیاں

بحال کرنے کا جو اعلان کیا تھا وہ نیک نیتی پر مبنی تھا۔ وہ دیانتداری سے کشمیر کے عوام کو ہندوستانی آئین میں دئے گئے بنیادی حقوق سے مکمل طور پر مستفید ہونے کا موقع دینا چاہتے تھے۔ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ بخشی غلام محمد کی ڈکٹیٹرشپ کے سائے میں ہندوستانی جمہوریت کو پنپنے کا موقع نہیں ملا ہے اور اگر عوام کے جمہوری حقوق بحال کر دئے جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ملک کے دیگر حصوں کی طرح ہندوستانی جمہوریت پر عوام کا اعتقاد مضبوط نہ ہو۔ لیکن بدقسمتی کی وجہ سے سرکار کی اس پالیسی کو اس سپرٹ میں قبول نہیں کیا گیا۔ جس نے اس کو جنم دیا تھا۔ اس کی بھی چند وجوہات ہیں۔ سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ پالیسی موئے مقدس کے ایجی ٹیشن کے فوراً بعد اپنائی گئی۔ موئے مقدس کی ایجی ٹیشن نے جو اپنے کردار اور ہمہ گیری کی بنیاد پر ریاست کی تاریخ میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد حیثیت رکھتی ہے، کشمیری عوام کے ذہن اور ان کی نفسیات کو ایک ہیجانی کیفیت عطا کی تھی۔ ان کی خود اعتمادی کے سوتے پھوٹ پڑے تھے۔ انہیں اپنی قوت اور اپنی آواز کے موثر ہونے پر بجا طور پر فخر کا احساس تھا۔ شمس الدین صاحب کی حکومت کے عبرت ناک انجام کو وہ اپنے زورِ بازو کا کارنامہ سمجھتے تھے اور صادق صاحب کے برسر اقتدار آنے کو وہ اپنی فتح کا اعلان تصور کرتے تھے۔ اس پسِ منظر میں جب صادق صاحب نے شہری آزادیوں اور جمہوری حقوق کی بحالی کا اعلان کیا۔ تو بجائے اس کے کہ مخالف جماعتیں اسے ایک پُرخلوص اور دیانتدارانہ پیشکش سمجھتیں، انہوں نے اسے حکومت سے زبردستی

چھینا ہوا ایک حق سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شروع سے ہی لبرلائزیشن کی پالیسی کو کمزوری اور خوش کرنے کی پالیسی تصور کیا گیا اور چند مخالف جماعتوں نے اس کے تمام جملہ حقوق بحقِ خود محفوظ کر لئے۔ فوراً بعد ہی شیخ صاحب کی رہائی عمل میں آئی۔ تو اسے بھی سیاسی صورت حال کو بہتر بنانے کی ایک دیانتدارانہ کوشش کی بجائے زبردست اندرونی اور بیرونی دباؤ کا نتیجہ قرار دیا گیا۔ غرض سرکار کی اس کاروائی کو جو ریاست میں خوشگوار جمہوری فضا قائم کرنے کے لئے کی گئی۔ چند مخالف جماعتوں نے اپنی سیاسی کامیابیوں کے کھاتے میں درج کر دیا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ملک میں بحیثیت مجموعی صادق صاحب کی اس پالیسی کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا گیا۔ چراغ بیگ کو ذاتی طور پر اس بات کا علم ہے کہ کچھ مرکزی وزیر بھی کشمیر سرکار کی اس پالیسی سے ناخوش تھے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ شہری آزادیوں کی بحالی اور جمہوری حقوق کی ضمانت کسی سیاسی جماعت کی کامیابی نہیں بلکہ ایک بڑا ہی جرأت مندانہ تجربہ تھا۔ جو بدقسمتی سے سیاسی مہم پسندی کا شکار ہو کر ناکام رہ گیا۔

لبرلائزیشن کی پالیسی کی ناکامی کی سب سے بڑی ذمہ داری اُن لوگوں پر ہے جنھوں نے شہری آزادی کو ہلڑ بازی کے مترادف سمجھا۔ جن کی نگاہوں میں یہ حکومت کی کمزوری اور احساس پشیمانی کی پیداوار تھی۔ ان لوگوں کو اب احساس ہو چکا ہو گا کہ ان کے اندازے غلط تھے۔ کچھ لوگ جو پورے دس سال تک بخشی غلام محمد کے جلسوں اور جلوسوں میں ''زندہ باد'' کے

نعرے لگاتے رہے، نئے تجربے سے شہ پا کر شیر ہو گئے اور انہوں نے حکومت کے خلاف نعرے لگانے شروع کئے۔ بعض لوگ جو پورے دس سال تک خواب خرگوش میں پڑے ہوئے تھے، یک لخت جاگ پڑے۔ انہیں اپنی بہادری اور جواں مردی کا فوراً احساس ہو گیا اور انہوں نے امن عامہ کو خراب کرنے میں اپنی ساری جواں مردی صرف کردی۔ وہ لوگ جو پچھلے اٹھارہ سالوں میں کبھی کھل کر اخبار نہیں پڑھ سکتے تھے۔ اب اخبار نویس ہو گئے۔ غرض شہری آزادیوں کی اس برسات میں سب جی بھر کر نہائے۔ ایک لحاظ سے یہ قدرتی بات تھی ''شجرِ ممنوعہ'' پر سے ممانعت اُٹھادی جائے تو اس پر ہجوم کا ٹوٹ پڑنا غیر متوقع بات نہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ آزادی کے آداب بھی پامال ہونے لگے۔ ہر سیاسی جماعت یہی سمجھنے لگی کہ شہری آزادیاں صرف اُسی کے لئے ہیں۔ اور دوسری جماعت کو ان سے فیضیاب ہونے کا حق نہیں ہے۔ ایک وقت میں چند سیاسی جماعتوں نے ایک دوسرے پر اپنی برتری منوانے کے لئے چاقو اور خنجر کا بھی استعمال کیا۔ غرض شہری آزادیوں کے بے جا استعمال اور استحصال کے لئے فریقین میں ایک غیر انعامی مقابلہ شروع ہوا۔ ترک موالات کی تحریک نے شہری آزادیوں کا رہا سہا تقدس چھین لیا اور رفتہ رفتہ حکومت کو یہ احساس ہونے لگا کہ اس کا اندازہ غلط تھا اور اُسے اپنے کئے پر پشیمانی ہونے لگی۔ حالانکہ یہ احساس اور یہ پشیمانی بے جا تھی۔ کیونکہ خود حکومت نے اپنی بدسلیقگی سے شہری آزادیوں اور ہلڑ بازی کو خلط ملط کردیا تھا۔ بخشی غلام محمد سے انتقام لینے کے لئے حکومت نے شروع میں وسیع

پیمانے پر غنڈہ گردی اور زبردستی کی حوصلہ افزائی کی۔ شروع سے ہی حکومت کا روّیہ مستحکم اور واضح ہونے کی بجائے چند سیاسی لیڈروں کی خوشنودی حاصل کرنے تک محدود رہا۔ گویا ایک لحاظ سے حکومت نے خود شہری آزادیوں کی پالیسی کو غلط سمجھنے میں عوام کی مدد ہی نہیں، ان کی حوصلہ افزائی کی۔ اور جب نتیجے کے طور پر حکومت کے سیاسی مخالفین نے شہری آزادی کے حربے کو اسی کے خلاف استعمال کیا تو سرکار والا مدار چونک گئی اور بجائے اس کے کہ اپنی پالیسی کو اور مستحکم بناتی، اس نے شہری آزادیوں کے خرگوش کو واپس پنجرے میں بُلانے کا فیصلہ کیا...... وجوہات کچھ بھی ہوں، حکومت اور مخالف سیاسی جماعتوں کی مشترکہ سازش نے لبریلائزیشن کی پالیسی کو ناکام بنادیا۔ جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے حکومت سے یہ حق زبردستی چھینا ہے، اب سمجھ گئے ہوں گے کہ حکومت نے ان سے یہ حق ایک بار پھر چھینا ہے۔ سرکار جو پالیسی اور مصلحت میں فرق نہ کرسکی، اب یہ سوچ رہی ہوگی کہ لوگ اس اہل نہیں ہیں کہ انہیں شہری آزادیاں دی جائیں۔ حالانکہ جو بات لوگوں کے بارے میں کہی جاسکتی ہے وہی حکومت کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ چراغ بیگ کا خیال ہے کہ یہ حکومت شہری آزادیاں دینے کی خواہش رکھتے ہوئے بھی اس اہل نہیں ہے کہ شہری آزادیوں کا تحفظ کرسکے۔ اس کے لئے اگر نئی حکومت نہیں تو نئے ذہن اور نئے نقطہ نظر کی سخت ضرورت ہے۔

حکومت اور ضربِ مخالف کی مشترکہ مساعی :-

بچھی کچھی شہری آزادیوں پر ۵/اگست کو پاکستان نے حملہ کردیا۔ دُنیا کی

کوئی حکومت جنگ کے دنوں میں شہری آزادیوں کی عیاشی کا بوجھ نہیں سنبھال سکتی۔ خود برطانیہ اور امریکہ میں بھی جنگ کے دنوں میں شہری آزادی اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہوتی ہے۔ اس لئے کشمیر میں ان دنوں بھرپور شہری آزادیوں کی بحالی کا مطالبہ دیوانے کے خواب سے کم نہ ہوگا۔ لیکن یہ صورت حال بہت دیر قائم رہنے کے باوجود عارضی ہے۔ سوال یہ ہے کہ موجودہ ہنگامی حالات سے نپٹنے کے بعد حکومت شہری آزادیوں کے متعلق کیا رویہ اختیار کرے گی؟ کیا وہ اپنی موجودہ پالیسی کو مستقل شکل دے کر بخشی غلام محمد کی سیاسی قابلیت دوراندیشی اور بالغ نظری کو خراج عقیدت پیش کرے گی۔ یا اپنی جرأت مندانہ پالیسی کو زیادہ مستحکم بنیادوں پر چلا کر یہ بات ثابت کردے گی کہ اس حکومت میں اپنی غلطیوں سے سبق حاصل کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ بخشی صاحب اور ان کے ساتھیوں کو خوش ہونے کی اس لئے ضرورت نہیں کہ وہ کبھی اس آگ سے کھیلے ہی نہیں ہیں ان کے دور حکومت میں کبھی لوگوں کو شہری آزادیاں دینے کی ''عیاشی'' ہوئی نہیں۔ اس لئے انہیں اس بات کا اندازہ بھی نہیں ہوسکتا۔ کہ اس ناکامی میں کامیابی کے کتنے امکانات پوشیدہ ہیں۔ ان کے دور استبداد میں کبھی پاکستان نے حملہ ہی نہیں کیا۔ اس لئے انہیں کبھی اس نازک صورت حال کا مقابلہ ہی نہیں کرنا پڑا۔ جس سے ہم اس وقت دوچار ہیں۔ صحیح فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے بھی اگر ایک آدمی کسی حادثے کا شکار ہوجائے تو اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ہمیشہ غلط فٹ پاتھ پر چلنا چاہئے۔ چراغ بیگ کو اس بات کا یقین ہے کہ حکومت

اپنی ناکامیوں سے گھبرا کر اپنی صحیح پالیسیوں پر پشیمان ہونے کی بجائے اپنی ناکامیوں میں سبق حاصل کرے گی۔ کیونکہ حکومتیں تجربات کو ذاتی پسند یا ناپسند کی بجائے ان کے تاریخی عوامل پر نگاہ رکھتی ہیں۔ اب ہلڑ بازوں اور سیاسی بازی گروں کی کھوپڑی میں یہ بات آچکی ہوگی۔ کہ شہری آزادیاں بنیادی حقوق ہوتے ہوئے بھی کسی کی نگہداشت اور دیکھ بھال کی مرہون منت ہوتی ہیں۔ ان سے کھیلا جاسکتا ہے لیکن صرف اسی شرط پر کہ کھیل کے قواعد وضوابط کا احترام ہو۔

☆

دسمبر ۱۹۶۶ء

۶

ریٹا فریہ کے نام:-

ریٹا ڈارلنگ!

معلوم نہیں کہ میرا یہ پریم پتر تمہیں کہاں اور کس وقت ملے۔ ہوسکتا ہے کہ اُس وقت تم ویت نام میں باب ہوپ کے ساتھ کسی امریکی فوجی بٹالین کے سامنے رقص میں مصروف ہو، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم پیرس کے کسی درزی کی دکان میں اپنے نئے لباس کے شہوانی امکانات کے متعلق تبادلۂ خیال کر رہی ہو۔ اس بات کا بھی اندیشہ ہے کہ تم اپنے بدقسمت منگیتر کے ساتھ کسی بات پر اُلجھ رہی ہوگی کچھ بھی ہو مجھے اس بات کا یقین ہے کہ یہ خط تم تک ضرور پہنچے گا۔ کیونکہ اب تم صرف رٹیہ فریہ ہی نہیں۔ مس ورلڈ ہو، لفافے پر تمہارا نام لکھنا ہی کافی ہے۔ کہ یہ خط تم تک پہنچ جائیگا۔ مس ورلڈ بننے کا سب سے بڑا فائدہ یہی تو ہے!

ریٹا! تم مجھے نہیں جانتی ہو، تم نے شاید میرا نام بھی نہیں سنا ہوگا۔ دو ہفتے پہلے میں بھی تمہیں نہیں جانتا تھا۔ اور سچ پوچھو تو میں نے تمہارا نام بھی

نہیں سنا تھا۔ لیکن جب سے تم عالمی مقابلہ حُسن میں مس ورلڈ چن لی گئی ہو میں تمہیں اچھی طرح جاننے لگا ہوں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے تم سے برسوں پرانی ملاقات ہے۔ تمہارا نام تو اب وردِ زبان ہے۔ تمہارے جسم کی پیمائش (35x24x35) بالکل زبانی یاد ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ مجھے تم سے عشق ہو گیا ہے۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں تمہارے بغیر ایک لمحہ بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ (ابھی تک کیوں کر زندہ ہوں، خود بھی معلوم نہیں، اسے خدا کی قدرت سمجھو) اخبارات میں جو تمہاری تصویریں چھپی ہیں۔ ان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم جمن نائی کی بڑی لڑکی سے زیادہ خوبصورت نہیں ہو (بلکہ اس کے مقابلہ میں خاصی بدصورت ہو) لیکن پھر سوچتا ہوں کہ جب تک تم میں کوئی خاص بات نہ ہوگی۔ تمہیں دنیا کی حسین ترین لڑکی کیوں قرار دیا جاتا۔ بس یہ سوچ کر تمہاری محبت اور زیادہ شدید ہو جاتی ہے۔ تم شاید میری اس کمزوری سے واقف نہیں ہو کہ میں ہر حسین لڑکی سے محبت کرتا ہوں (حسین لڑکیاں مجھے کوئی لفٹ نہیں دیتیں) اب اندازہ کرو کہ جو لڑکی دنیا بھر کی حسین ترین لڑکی قرار پائے۔ اس سے میری محبت کا کیا عالم ہوگا!

ریٹا! ہندوستان کے کچھ تنگ نظر اور جاہل لوگ تم سے بہت ناراض ہیں۔ کہ تم نے ویت نام جا کر امریکی سپاہیوں کا دل بہلانے (دل دہلانے؟) کی پیشکش کیوں قبول کر لی، تم اس کی فکر نہ کرنا، معلوم ہوا کہ وہ بوڑھا مہتہ اور چھاگلہ بھی بہت غرایا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ تم نے کسی کی ایک بات نہیں سُنی ۔ بلکہ یہ سن کر بھی بڑی خوشی ہوئی کہ تم اپنی کسی بات پر بھی قائم نہیں رہتی

ہو۔صبح ایک بات کہتی ہو شام دوسری بات ۔ یہ بڑی اچھی بات ہے۔ آخر ایک بات پر قائم رہنے سے کسی کے حسن میں کیا اضافہ ہوسکتا ہے اور پھر تمہارا حُسن بھی تو ہمیشہ رہنے والی چیز نہیں ۔ہاں تو تم ویت نام ضرور جاؤ۔ پھر یہ موقع کہاں ہاتھ آئے گا۔ ویت نام میں امریکی سپاہی بڑے بددل اور مایوس ہوگئے ہیں۔ ویٹ کانگ کے ہاتھوں انہوں نے بڑے دُکھ اُٹھائے ہیں۔تم جاؤ گی تو ان کا گرتا ہوا حوصلہ ایک بار پھر بلند ہو جائے گا۔

تم نہیں جانتی ہو کہ تمہاری وجہ سے ہندوستان کا گرتا ہوا وقار کس قدر بلند ہوگیا ہے ۔تم نے ساری دنیا پر یہ بات واضح کردی کہ ہندوستان میں روپے کی قیمت اور خوراک کی پیداوار کم ہوگئی ہو،تو ہو،لیکن حسن و جمال کی پیداوار میں یہ ملک دوسرے ممالک کے مقابلے میں فوقیت رکھتا ہے۔تم میری بات مانو ،تو ویت نام سے جلدی فراغت پا کر ہندوستان لوٹ آؤ ، آئندہ انتخابات میں اندرا گاندھی کے مقابلے میں کھڑے ہو جاؤ۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ شریمتی اندرا گاندھی کی ضمانت بھی ضبط ہو جائے گی۔ جب تک ہندوستان میں چراغ بیگ جیسے حسن پرست موجود ہیں تم جیسی حسیناؤں کو کوئی غم نہیں ۔تم پارلیمنٹ کے لئے منتخب ہو جاؤ گی ۔تو تمہارا وزیر یا وزیراعظم بننا بھی ناممکن نہیں ۔اب رہا تمہارا منگیتر مسٹر نوبو ۔اس بچارے کے مقدر میں حسرتوں کے سوا کچھ نہیں ۔اس کا نام ہی اب ریٹھ فریا کا منگیتر پڑ گیا ہے اس سے شادی کرنے کے سوال پر اب تمہیں از سرِ نو غور کرنا پڑے گا۔ میرا خیال ہے کہ ریشم میں ٹاٹ کا پیوند بڑی بدذوقی ہوگی۔ تمہیں یہ نہیں

بھولنا چاہئے کہ تم ریٹہ فریا ہی نہیں ۔ مس ورلڈ بھی ہو۔ تم کب آ رہی ہو؟ اس کی اطلاع مجھے اخبارات کے ذریعہ مل ہی جائے گی۔ لیکن تم آنے کے ساتھ ہی کشمیر چلی آنا (بڑی خوبصورت جگہ ہے کشمیر) تمہیں معلوم ہے کہ اپنے شمیم صاحب بھی آئندہ انتخابات میں شوپیان سے بطور آزاد اُمیدوار کے کھڑے ہورہے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ تم شوپیان کے حلقہ انتخاب میں جا کران کے حق میں پروپگنڈا کرو۔ کیونکہ تمہاری بات ٹالنے کی کس ماں کے لال میں جرأت ہوگی۔ لیکن اس بات کا خیال رکھنا کہ وہاں بُرقعہ پہن کر جانا ہوگا۔ ورنہ شمیم صاحب کا بیڑا پار کرنے کی بجائے ان کی لٹیا ہی ڈبودوگی......

تمہارا پریمی چراغ بیگ

مول چترا گام کا افسوس ناک سانحہ!:۔

پچھلے مہینے شوپیان سے ۷ میل دور ایک گاؤں مول چترا گام میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا، جو اگر ملک کیا ریاست کے کسی بھی حصے میں رونما ہوا ہوتا تو بڑے عبرتناک نتائج کا حامل ہوسکتا تھا۔ رات کے اندھیرے میں ایک پولیس پارٹی، جو کسی دوسری واردات کے سلسلے میں تحقیق و تفتیش کے لئے کہیں جارہی تھی، نے مول چترا گام پہنچ کر عزیز گنائی کے مکان کا محاصرہ کرلیا کہ وہاں صدیق گنائی نے اپنی لڑکی کی شادی کے موقع پر ایک بھینس ذبح کرلی تھی۔ پولیس کی یہ پارٹی جو ایک سزا یافتہ تھانیدار کی قیادت میں شوپیان پولیس سٹیشن میں اپنی روانگی ڈالے بغیر مول چترا گام پہنچی تھی، ایک ایسے جرم، میں دست اندازی کررہی تھی جس کا اِسے قانونی طور پر کوئی اختیار حاصل نہیں

تھا لیکن اس خیال سے کہ مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے سزا یافتہ تھانیدار نے دیہاتیوں کو ڈرانا دھمکانا شروع کردیا۔ میری اطلاع کے مطابق مجرموں نے تھانیدار صاحب کو مطمئن کرنے کے لئے ڈیڑھ سو روپے کی پیشکش کی تھی، لیکن وہ پانچ سو روپے کے لئے مُصر رہے لین دین کے اسی مناظرے میں ایک سپاہی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، گولی چلادی اور نبہ راتھر نامی ۲۷ سالہ نوجوان وہیں گرِ کر ہلاک ہوگیا۔ عزیز گنائی بُری طرح زخمی ہوگیا اور گاؤں بھر میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ اس کے فوراً بعد تھانیدار صاحب اپنے سپاہیوں سمیت بھاگ نکلے۔ لیکن دیہاتیوں نے ان کا تعاقب کر کے اُنہیں گرفتار کرلیا۔ اب اس معاملے میں شوپیان پولیس تحقیقات کررہی ہے اس مرحلے پر ملزموں کی معصومیت یا معصیت کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت ہے لیکن ایک بات کی طرف اشارہ کرنا بہت ضروری ہے اور وہ یہ کہ اس پولیس پارٹی کی قیادت تھانہ خانیار کے، اے، ایس، آئی مٹر درباری کررہے تھے۔ مسٹر درباری پر ایک حاملہ عورت کے ساتھ زبردستی کرنے کے الزام میں مقدمہ چل رہا ہے۔ انہیں اے، ڈی، ایم سرینگر نے توہین عدالت کے سلسلے میں جرمانہ کی سزادی ہے اور اس کے باوجود وہ ابھی تک معطل نہیں ہوئے ہیں۔ اور مول چترا گام کے اس سنگین واقعہ کے بعد بھی وہ بدستور اپنے عہدے پر متمکن ہیں کیا اس سے یہ قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ کہ مسٹر درباری کو محکمہ پولیس میں لاڈلے شہزادے کی حیثیت حاصل ہے؟ اور پولیس کے افسران ان کی ہر شرارت کو ان کی ''شوخیوں'' سے تعبیر کر کے نظرانداز کرجاتے ہیں؟ ریاستی

پولیس ویسے بھی اپنی بدعنوانیوں ، بے ضابطگیوں اور بے شرمیوں کے لئے ہندوستان بھر میں مشہور ہے ۔ یہ کیا ضروری ہے کہ اس شہرت میں اضافہ کرنے کے لئے مسٹر درباری جیسے خونخوار درندوں کو بھی اپنے جوہر دکھانے کی کھلی چھٹی دی جائے ۔

اس سانحے کے فوراً بعد چراغ بیگ مول چترا گام گیا اور اس نے بہ نفسِ نفیس اس ڈرامے کے اہم کرداروں سے بات چیت کی ۔ یہ ریاستی حکومت اور مسٹر درباری کی خوش قسمتی ہے کہ اس گاؤں میں جماعت اسلامی کا بڑا اثر و رسوخ ہے ۔ اور اس اشتعال انگیز واقعے کے باوجود وہاں کے بزرگوں نے نوجوانوں کو صبر و تحمل کی تلقین کی ۔ اور انہوں نے کوئی ایسا غیر ذمہ دارانہ قدم نہیں اُٹھایا ۔ جس کے نتائج یقیناً سخت افسوس ناک ہو سکتے تھے ۔ یہ واقعہ کسی دوسرے گاؤں میں ہوا ہوتا ۔ تو مسٹر درباری اور ان کے ساتھیوں کا سراغ ملنا ممکن نہ ہوتا ۔ اس واقعے کے فوراً بعد کچھ سیاسی تیمیوں نے موقع پر پہنچ کر حکومت کے خلاف نفرت اور عداوت کی آگ بھڑکانا چاہی تھی ۔ لیکن خوش قسمتی سے مول چترا گام کے باشندوں نے اس فریب میں آنے سے بھی انکار کر دیا ۔ اور اپنی کھوئی ہوئی کرسی کی تلاش میں معصوم دیہاتیوں کو ورغلانے والے اپنا سامنہ لے کر واپس آ گئے ۔ لیکن مول چترا گام کے دیہاتیوں کے ربط و ضبط اور قانون کے احترام کا مقصد ہرگز ہرگز یہ نہ ہونا چاہئے ۔ کہ ریاستی حکومت اس سنگین واقعے کو ایک پولیس افسر کی بے ضابطگی قرار دے کر اپنے فرائض سے سبکدوش ہو جائے ۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ

مسٹر درباری جیسے مجرم افسروں کے خلاف سخت کاروائی کر کے انہیں سخت سے سخت سزا دی جائے۔

سنسنی خیز!:-

صادق وزارت کے ایک ''ترقی پسند'' وزیر کے متعلق یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا ہے کہ اس نے آج سے چند ہفتے قبل رات کے اندھیرے میں شرما ہوس، سونہ وار میں سابق وزیر اعظم بخشی غلام محمد سے طویل ملاقات کی۔ اس نمائندے کی اطلاع کے مطابق اس مقصد کے لئے ایک دوست کی پرائیویٹ کار حاصل کی گئی تھی اور یہ ملاقات رات کے بارہ بجے سے ڈیڑھ بجے تک جاری رہی۔ سابق وزیر اعظم اور ''ترقی پسند'' وزیر کے درمیان کس موضوع پر بات چیت ہوئی۔ اس کے متعلق اس نمائندے کی معلومات زیادہ معتبر نہیں ہیں۔ کیونکہ ملاقات کے وقت کوئی تیسر آدمی موجود نہیں تھا لیکن ''ترقی پسند'' وزیر کے ایک راز داں ساتھی (جنہوں نے اس نمائندے کو یہ واقعہ سنایا) کا کہنا ہے کہ وزیر موصوف صادق صاحب اور ان کے ساتھیوں سے بہت بددل ہو گئے ہیں اور وہ ایک بار پھر پرانے صنم پوجنا چاہتے ہیں۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ ملاقات کی درخواست ''ترقی پسند'' وزیر نے کی تھی ۔اور اس سے قبل کئی مرتبہ وہ سابق وزیر اعظم سے ملنے کی کئی ناکام کوششیں کر چکے ہیں اس ملاقات کے نتائج کے متعلق چراغ بیگ کو انتظار ہے۔

☆

۱۹۶۸ء

۷

دور کے ڈھول سہانے:-

پچھلے دنوں جب آل انڈیا ریڈیو سے یہ خبر نشر ہوئی، کہ پاکستانی مقبوضہ کشمیر کے ایک احتجاجی جلسے میں ہندوستان زندہ باد کے نعرے بلند کیئے گئے۔تو بہت سے لوگوں نے اسے محض ایک ''ریڈیوا یکٹوگپ''سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔دوسرے دن اخبارات میں یہی خبر جب ایک فرانسیسی خبر رسان ایجنسی کے حوالے سے شائع ہوئی تو کچھ لوگوں کے دلوں میں یہ شبہ ضرور پیدا ہوا کہ ہو نہ ہو یہ سچ ہے لیکن دونوں ملکوں کے اخبارات اور ریڈیو ایک دوسرے کے متعلق اسقدر جھوٹ بول چکے ہیں کہ ہندوستان میں زیادہ تر لوگ اس خبر کو خانہ ساز من گھڑت اور بے بنیاد ہی سمجھتے رہے۔کشمیر میں اکثر لوگوں نے اسے ''آل انڈیا ریڈیو کی آرڈی ننس فیکٹری'' میں تیار شدہ توپ قرار دے کر اس کا مذاق اُڑایا اور فرانسیسی خبر رسان ایجنسی کے حوالے کو ''سفید جھوٹ'' سے تعبیر کر کے اپنے ایمان اور اعتقاد کی حفاظت کی۔میں نے جیسا کہ عرض کیا ہے، کہ دونوں ملکوں کے ریڈیو اور اخبارات نہ صرف

ایک دوسرے کے ہاں، بلکہ اپنے اپنے ملکوں میں اپنا اعتبار کھو چکے ہیں۔اس لئے ریڈیو سے نشر ہونے والی اور اخبارات میں شائع ہونے والی اکثر سچّی خبر وں کو بھی لوگ ''پروپگنڈا'' سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔'' آزاد کشمیر میں ''ہندوستان زندباد'' کے نعرے بلند ہونے کی خبر ایک ایسی ہی سچّی خبر ہے!

بادی النظر میں یہ بات ناممکن دکھائی دیتی ہے، کہ ''آزاد کشمیر'' میں کسی کو ہندوستان نواز نعرے بلند کرنے کی ضرورت اور ہمت ہو، لیکن حقیقت چونکہ افسانے سے زیادہ دلچسپ اور پُراسرار ہوتی ہے، اس لئے اس امکان کو قطعی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، کہ کچھ لوگ ''آزاد کشمیر'' سرکار کی دھاندلیوں اور حکومت پاکستان کی مجرمانہ غفلت سے اس قدر تنگ آ گئے ہوں، کہ انہوں نے اپنے غیض وغضب کا اظہار کرنے کے لئے ہندوستان زندہ باد کے نعرے بلند کئے ہوں۔میں یہ بات اپنے اُس تجربے کی بناء پر کہہ رہا ہوں، کہ جو مجھے ۱۹۶۹ء میں ''آزاد کشمیر'' کے دورے کے دوران حاصل ہوا تھا۔اس سے پہلے میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ ''آزاد کشمیر'' کے لوگوں کو پاکستان سے لاکھ شکایات ہوں، لیکن پھر بھی وہ اپنے اسلامی ملک کے خلاف ایک لفظ برداشت کرنے کے لئے تیار نہ ہوں گے۔خاص طور پر وہ کشمیری جو گھر بار چھوڑ کر ''ارض پاک'' کا طواف کرنے کے لئے گئے ہیں۔ لیکن ''آزاد کشمیر'' میں وارد ہونے سے پہلے ہی میرا اندازہ غلط ثابت ہونے لگا۔لاہور اور راولپنڈی میں مقیم مہاجرین کشمیر نے میرے سامنے پاکستان کا ایک ایسا نقشہ کھینچا، کہ میرے لئے یہ یقین کرنا مشکل ہو گیا، کہ نقشہ کھینچنے

والے وہی کشمیری مسلمان ہیں، کہ جن کے لئے پاکستان خوابوں کی جنت ہی نہیں، ایمان کی دولت اور زندگی کا واحد مقصد تھا؟ ''آزاد کشمیر'' پہنچتے پہنچتے میرے مبہم خیالات اور غلط اندازوں کی دنیا چکنا چور ہوگئی۔ اور حقیقت اپنی تمام تر تلخیوں اور ناہمواریوں کے ساتھ عریاں نظر آنے لگی۔ میں نے ''آزاد کشمیر'' کے لوگوں کو اپنے ہاں کے لوگوں سے زیادہ ناآسودہ بے چین اور برہم پایا۔ چند دن کے مختصر سے قیام کے دوران میں نے محسوس کیا، کہ پچھلے بیس پچیس برسوں میں یہاں روشنی پھیلنے کی بجائے اندھیرا زیادہ گہرا ہوگیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی گھٹن کا احساس بھی زیادہ شدید ہوگیا ہے۔ محمد یوسف قریشی، غلام نبی گلکار، مولوی عبداللہ شاہ شوپیانی، ایم اے صابر اور میر عبدالعزیز، یہ وہ لوگ ہیں جو پاکستان بننے سے بہت پہلے پاکستان کے عاشق تھے، اور جن کے لئے پاکستان دین کا معیار اور ایمان کی علامت تھی۔ لیکن پاکستان میں بیس بائیس برس رہ کر یہ لوگ پاکستان سے اس درجہ بے زار اور وطن لوٹنے کے لئے اس درجہ بے قرار تھے، کہ ان کی حالت دیکھ کر مجھے ان پر رحم آنے لگا، آزاد کشمیر میں سینکڑوں ایسے کشمیریوں سے ملاقات ہوئی کہ جو ۱۹۶۵ء کی جنگ میں اپنا سب کچھ چھوڑ کر اس اُمید پر ''آزاد کشمیر'' میں وارد ہوگئے تھے، کہ ''ہندوستانی کشمیر'' کے مظالم سے نجات پا کر پاکستان کی عطر بیز اسلامی ہواؤں میں جی لیں گے، لیکن تین ہی چار سال میں ''آزاد کشمیر'' کی آزادی میں ان کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اور وہ کسی طرح اور کسی قیمت پر ''غلامی'' اور ''محکومی'' کی جنت میں لوٹنا چاہتے تھے۔ ''آزاد کشمیر'' اور

پاکستان میں کشمیریوں کی یہ بے چینی ، بے اطمینانی اور بیزاری اور پاکستانی حکمرانوں کے تئیں شدید نفرت کے جذبات میرے لئے ایک غیر متوقع تجربہ تھا، میں ہندوستانی ریڈیو اور اخبارات کی ہر خبر کو محض ''پروپگنڈا'' سمجھ کر نظر انداز کرتا رہا تھا۔اور مجھے یقین تھا، کہ یہ خبریں دلی اور سرینگر کے ''اسلحہ خانوں'' میں تیار کی جاتی ہیں اور میرے لئے یہ یقین کرنا محال تھا، کہ کشمیری مسلمان بھی پاکستان کی سلامتی اور سالمیت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔لیکن اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جب مظفر آباد میں ایک سخت قسم کے مسلم لیگی نے مجھے بتایا، کہ ۱۹۶۵ء میں ہم یہ دُعا کر رہے تھے، کہ ہندوستانی فوجیں ہمیں پاکستانی مظالم سے نجات دلانے میں کامیاب ہوجائیں اور یہ وہی شخص تھا، کہ جو پاکستان آنے سے پہلے پاکستان کا کلمہ پڑھتا تھا۔ چند دنوں کے قیام میں مجھے معلوم ہوا، کہ ''آزاد کشمیر'' میں ریڈیو کشمیر اور آل انڈیا ریڈیو کو اس توجہ اور دلچسپی سے سُنا جاتا ہے، کہ جس طرح ہمارے ہاں ''آزاد کشمیر'' ریڈیو اور ریڈیو پاکستان کو، آزاد کشمیر جانے سے پہلے میرا یہ خیال تھا، کہ ہندوستان کی حکومت نے کشمیریوں کے ساتھ جو نا منصفانہ اور غیر جمہوری رویہ روا رکھا ہے، اس کی مثال ملنا مشکل ہے، لیکن ''آزاد کشمیر'' سے لوٹ کر میں یہ محسوس کر رہا تھا، کہ پاکستانی حکمرانوں نے یہ میدان بھی مار لیا ہے۔ اس لئے پاکستانی مقبوضہ کشمیر میں ہندوستان نواز نعروں کی خبر سُن کر مجھے حیرت نہیں ہوئی، اور جب اِس خبر کے ساتھ ایک فرنچ نیوز ایجنسی کا حوالہ دیا گیا تو مجھے اس کی صحت کا پورا یقین ہو گیا۔ ''آزاد

کشمیر'' کے صدر سردار عبدالقیوم شروع سے ہی کشمیریوں کے سخت مخالف اور بہت بڑے دشمن ہیں، انہوں نے اپنی معاندانہ روش سے کشمیریوں کو اس درجہ برہم اور بیزار کردیا ہے کہ وہ کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ تعجب نہیں، کچھ لوگوں نے جل بُھن کر ہندوستان زندہ باد کا نعرہ بلند کردیا ہو، ہندوستان نواز نعرے لگانے کا مطلب ہندوستان سے محبت کی بجائے دراصل پاکستان کے خلاف نفرت کا اظہار کرنا ہے اور کسی ہندوستانی بزرگ کو اس غلط فہمی میں مبتلا نہ رہنا چاہیئے، کہ ''آزاد کشمیر'' اور پاکستان میں رہنے والے کشمیری پاکستان سے مایوس ہوکر اب ہندوستان کے عشق میں گرفتار ہوگئے ہیں، جس طرح ہندوستانی رہنماؤں اور حکومت کے مارے ہوئے کشمیریوں کو پاکستان میں دودھ کی نہریں بہتی دکھائی دیتی ہیں۔ اسی طرح پاکستان میں کشمیریوں کو ہمارے ہاں شہد کے دریا بہتے نظر آتے ہیں۔ اہل کشمیر کے اس ''فریب نظر'' پر مرحوم میر واعظ مولوی محمد یوسف شاہ نے اپنے مخصوص انداز میں جو تبصرہ کیا تھا، وہ ان ہی کی زبانی ملاحظہ کیجئے، روایت ہے، کہ جب پاکستان کے اُس وقت کے وزیراعظم چودھری محمد علی نے ان سے دریافت کیا، کہ کشمیر میں استصواب رائے کی صورت میں کشمیر کے لوگ پاکستان کے حق میں ووٹ دیں گے یا ہندوستان کے؟ تو میر واعظ مرحوم نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا، کہ ''وہاں کے لوگ آپ کو ووٹ دیں گے اور یہاں کے لوگ ان کو''۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں میر واعظ صاحب'' اور یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟''

چودھری صاحب نے حیران ہوکر پوچھا۔

''بات یہ ہے کہ ہم نے آپ کو دیکھ لیا ہے اور وہاں کے لوگوں نے ان کو دیکھ لیا ہے۔'' میر واعظ صاحب نے بڑی تازگی اور پُر کاری سے جواب دیا اور ان کے اس جواب میں کشمیر اور آزاد کشمیر کی ساری حکایت پوشیدہ ہے۔

جاہلانِ قوم کا احتجاج:۔

کئی سال کی بات ہے کہ ''آئینہ'' کے مدیر شمیم احمد شمیم نے اپنے ایک اداریئے میں پارلیمنٹ کے ممبران کو جاہل، کہہ کر ایک طوفان کھڑا کر دیا تھا۔ (آج شمیم صاحب خود بھی ان ہی جاہلوں کی صف میں کھڑے ہیں) پرکاش ویر شاستری نے ان کے خلاف مراعت شکنی کی تحریک پیش کر کے یہ مطالبہ کیا تھا، کہ اس گستاخی کے لئے انہیں سخت سے سخت سزا دی جائے اور معاملہ لوک سبھا اور راجیہ سبھا کی مراعتی کمیٹیوں کے سپرد ہوا تھا۔ راجیہ سبھا کی مراعتی کمیٹی کے سمجھ دار ممبروں نے دو ہی تین نشستوں میں یہ فیصلہ کر دیا، کہ لفظ جاہل، سخت ضرور ہے، لیکن غیر پارلیمانی نہیں اور انگریزی میں اس کے معنی Ignorant کے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد لوک سبھا کی مراعتی کمیٹی کو بھی عقل آگئی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ آج جبکہ شمیم احمد شمیم پارلیمنٹ کے رکن ہیں۔ چراغ بیگ انہیں یہ یاد دلانا چاہتا ہے کہ ان کے ممبر بن جانے کے بعد بھی پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کے ممبران کی جہالت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے اور اس جہالت کا تازہ ترین مظاہرہ ۱۸/اپریل کو یو، پی اسمبلی کے ایوان میں ہوا ہے۔ یوں تو پارلیمنٹ اور مختلف ریاستی اسمبلیوں میں جہالت اور حماقت کے اتنے مظاہرے ہوتے ہیں کہ یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے، کہ ان مقدس

ایوانوں، میں عقل کی بات کس وقت ہوتی ہے۔ لیکن یو، پی اسمبلی میں مشہور اُردو شاعر آنند نرائن ملا کے ایک شعر پر جو لے دے ہوئی ہے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے، کہ جہالت اور حماقت میں یو پی اسمبلی کے کچھ جاہل ممبران نے عالمی ریکارڈ توڑنے کی قسم کھائی ہے۔ ۱۸/اپریل کو کانگریس (او) بی کے ڈی، سمیکت سوشلسٹ پارٹی اور دوسرے کئی مخالف ممبروں نے آنند نرائن ملا ایم، پی پر الزام لگایا کہ انہوں نے شہیدانِ قوم کی توہین اور تذلیل کی ہے۔ اور اس کے ثبوت میں ملاّ صاحب کا یہ شعر پیش کیا۔

خونِ شہید سے بھی ہے قیمت میں کچھ سوا
فن کار کے قلم کی سیاہی کی ایک بوند

بدقسمتی سے سخن فہمی ایک ایسا جوہر ہے، کہ جو فطرت کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے اور اسے بازار میں خریدا نہیں جا سکتا۔ سیاسی مول تول کرنے والے جب شعر و ادب میں ٹانگ اڑا کر اپنی جہالت کا اشتہار دینے پر آمادہ ہو جائیں تو وہی صورت حال پیدا ہوگی، جو ۱۸/اپریل کو یو، پی اسمبلی میں دیکھنے میں آئی، ایک سے بڑھ کر ایک ''سیاسی رستم'' ملاّ صاحب کی نازک خیالی اور معنی آفرینی پر حملہ آور ہو کر بدذوقی اور علمی جہالت کے میدان میں ''دادِ شجاعت'' دے رہا تھا۔ اور ملاّ صاحب کے مجموعہ کلام ''سیاہی کی بوند'' پر پابندی عائد کرنے کا مطالبہ کر رہا تھا۔ ایوان میں کاکوری کیس کے شہید زندہ باد اور آنند نرائن ملاّ مردہ باد کے نعرے لگائے گئے اور ایس، ایس، پی کے ممبران ۴۵ منٹ تک ایوان کی کاروائی میں مخل ہوتے رہے۔ چیف منسٹر

کملا پتی ترپاٹھی نے مظاہرین کو مطمئن کرنے کی کوشش کی، کہ وہ ادب کے ماہروں اور عالموں سے اس شعر کے معنی اور وضاحت طلب کر کے اسے ایوان کے سامنے رکھیں گے، لیکن مخالف جماعتوں کے ''ابوجہل'' اِس یقین دہانی پر بھی مطمئن نہ ہوئے اور دلچسپ بات ہے، کہ لکھنو اُردو شاعری اور اُردو تہذیب کا سب سے بڑا مرکز اور اُردو شاعروں کا بہت ہی محبوب شہر رہا ہے۔ آج اِسی مرکز میں اُردو کی بے بسی اور بے کسی کا یہ عالم ہے، کہ وہاں اُردو کا یہ معمولی شعر سمجھنے والا کوئی سخن فہم نظر نہیں آتا۔

ملّا صاحب کے اسی شعر سے شہیدوں کی توہین ہوتی ہے یا نہیں، میں اس پر بحث نہیں کروں گا۔ کیونکہ یہ الزام اتنا بھونڈا اور بے ہودہ ہے۔ کہ اس کا نوٹس لینا بھی ذوقِ سلیم اور ذہن رسائی کی تذلیل ہے۔ لیکن یو، پی اسمبلی کے سیاسی پہلوانوں کی خدمت میں یہ عرض کئے بغیر نہ رہوں گا، کہ شعر و سخن کی وادی سیاست کا اکھاڑہ نہیں، کہ جس نے چاہا، لنگر لنگوٹ کس لیا۔ ایک عمدہ شعر کہنے کے لئے ہزاروں عمدہ شعر پڑھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ شعر کہنے کے لئے تو ریاض کی ضرورت ہوتی ہی ہے، لیکن شعر کی روح کو سمجھنے کے لئے بھی کم ریاض نہیں کرنا پڑتا۔ اور یہ ہر ایرے غیرے کے بس کی بات نہیں ہوتی، شاعری کو پیغمبری کا درجہ حاصل ہے اور شاعر کے تخیل کی اُڑان کسی سیاسی لیڈر یا گیڈر کی مرضی یا منشاء کے تابع نہیں ہوسکتی۔ اُردو شاعری کا مزاج ابتداء سے باغیانہ رہا ہے اور اُردو شاعروں نے شہیدوں، وزیروں اور بادشاہوں سے ہی نہیں، خدائے برتر کی شان میں بھی گُستاخیاں

کی ہیں، یو، پی اسمبلی کے زباندانوں نے شہیدوں کے خون اور فن کار کی سیاہی کی ایک بوند کو ترازو میں تول کر ملاّ صاحب کے دعویٰ کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، ہے کوئی جوان لاعلموں کو یہ سمجھائے، کہ جس طرح پھول کی مہک، بلبل کے نغمے اور بادنسیم کے جھونکے ترازو میں نہیں تولے جاسکتے۔اسی طرح ملاّ صاحب کا یہ شعر بھی سیاست کے ترازو میں نہیں تولا جاسکتا۔شاعر کے قلم، اس کی فکر اور اس کے اسلوب پر پابندی عائد کرنے کی ہر کوشش ایک مریض اور مفلوج ذہن کا خاصہ ہے۔افسوس اس بات کا ہے، کہ اس قسم کا مطالبہ حزب مخالف کی طرف سے کیا گیا ہے، لیکن جہالت صرف حکومت ہی کی نہیں، اپوزیشن کی بھی میراث ہے اور اسی لئے اس پر سوائے ماتم کرنے کے کچھ اور نہیں کیا جاسکتا۔

☆

مارچ ۱۹۶۶ء

۸

حقِ ملاوٹ (بروزنِ حق خود ارادیت):-

سرینگر میونسپلٹی کے ایڈمنسٹریٹر کی قیادت میں اشیائے خوردونوش میں ملاوٹ کے خلاف جومہم شروع کی گئی ہے چراغ بیگ اس کا خیر مقدم کرتا ہے۔ باوجود اس کے کہ اس مہم کے نتیجے میں وہ پچھلے ایک ہفتے سے قہوہ پینے پر مجبور ہو گیا ہے کہ اس میں دودھ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ایک اطلاع کے مطابق ''جرم ملاوٹ'' صرف شہر کے شیر فروشوں پر ہی ثابت نہیں ہوا ہے۔ بلکہ محکمہ افزائش نسل حیوانات کے زیر اہتمام دودھ سپلائی کرنے والا ادارہ بھی اس خباثت میں برابر کا شریک ہے۔ کہا جاتا ہے کہ گائے اور بھینس کا دودھ فراہم کرنے والے اس ادارے نے امرتسر کے ایک بیوپاری کے ساتھ اندرونی انتظام کے زیر اہتمام پوڈر ملک حاصل کرنے کا معاہدہ طے کیا تھا۔ اور شہریوں کی گرتی ہوئی صحت کو مزید گرنے سے بچانے کے لئے انہیں اصلی دودھ کی بجائے یہ ''طاقتی دودھ'' مہیا کیا جا رہا تھا۔ چراغ بیگ کا خیال ہے کہ رفاہِ عامہ کے اس کام پر ادارۂ افزائش نسل حیوانات کے حیوانوں کو

''انسانیت'' کا سب سے بڑا تمغہ دیا جانا چاہئے۔ ملاوٹ کے خلاف مہم چلانے والوں کی خدمت میں دو گذارشات کرنا چاہتا ہوں۔ ایک یہ کہ ملاوٹ کرنے والے اتنے کمزور نہیں ہیں جتنا آپ کو دکھائی دے رہے ہیں۔ یہ ہمارے سڑے گلے معاشرے کے سب سے طاقتور اور بارسوخ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی پہنچ حکومت اور قانون کے بڑے سے بڑے ایوان تک ہے دوسری بات یہ ہے کہ ملاوٹ صرف دودھ، ہلدی، تیل اور گھی میں نہیں ہمارے ضمیروں اور ہمارے ذہنوں میں بھی ہے۔ ہماری سیاست میں بھی ہے اور ہماری صحافت میں بھی۔ ہمارے لیڈروں کی تقریروں میں بھی اور ہمارے وزیروں کے دعدوں میں بھی۔ غرض زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو ملاوٹ کا شکار نہیں۔ ہمارے اقتصادی ڈھانچے۔ سیاسی نظام اور اخلاقی تصورات کا اگر کوئی ایک عنوان ہوسکتا ہے تو وہ ہے ملاوٹ...... ملاوٹ کی وبا ختم کرنا چاہتے ہو تو دودھ اور ہلدی کی ملاوٹ کے ساتھ ساتھ ان ایوانوں پر بھی یلغار کر دو جہاں ''ملاوٹ'' کو ''کامیابی'' اور ''ذہانت'' کا معیار مان کر ملاوٹ کرنے والوں کو خلعتیں عطا کی جاتی ہیں۔ جس شہر میں پینے کو خالص پانی بھی فراہم نہ ہو رہاں خالص دودھ کی کیوں تلاش کی جائے۔ جس شہر میں دو سال بعد بھی اصلی مجرم کا سُراغ نہ مل سکے۔ وہاں اصلی گھی کی تلاش کیوں کی جائے۔ چراغ بیگ کو یہ شبہ ہے کہ یہاں کی گایوں نے اصلی دودھ دینا ہی بند کر دیا ہے۔ انہیں چونکہ خود ملاوٹ والی غذا کھانے کو ملتی ہے اس لئے وہ پیٹ میں ہی دودھ کے ساتھ پانی ملا کر ہم سے انتقام لے رہی ہیں۔

شہر میں دودھ اور دھی کی نایابی سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ملاوٹ کرنے والے حق ملاوٹ (بروزنِ حق خود ارادیت) کے حصول کے لئے متحد ہو رہے ہیں۔

کہ درویشی بھی عیّاری ہے:-

۷ فروری کو سرینگر سے جموں جاتے ہوئے فوکر فرنڈشپ جہاز کے حادثے میں ہلاک ہونے والی لاشوں کی ہیئت دیکھ کر یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ یہ بدقسمت جہاز آن واحد میں ''ہُونی ہنگ'' کی چوٹی سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا ہے۔ تین سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے چلنے والا جہاز جب یک لخت کسی پہاڑ یا چٹان سے ٹکرا جائے تو اس میں سے کسی سواری کے بچ نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عقل سلیم یہ کہتی ہے کہ جہاز میں سوار ۳۷ مسافروں کی موت چند سکینڈوں میں واقع ہوئی ہوگی لیکن ''فقیروں''. ''درویشوں'' اور ''جوتشیوں'' نے اس سانحہ عظیم کو بھی مال تجارت بنانے سے گریز نہیں کیا۔ مصیبت زدوں اور ضعیف الاعتقاد رشتہ داروں کو یہ ''خوشخبریاں'' سنائی گئیں کہ ان کے عزیز زندہ ہیں۔ اور یہ سلسلہ جب تک جاری رہا جب تک برف تلے سے ہلاک شدگان کی لاشیں دستیاب نہ ہوئیں۔ ''پیشگوئیوں'' کے اس مقابلے میں مقامی فقیروں اور آل انڈیا شہرت رکھنے والے جوتشیوں نے خُوب خُوب کرتب دکھائے۔ ایک جوتشی جی مہاراج نے دعویٰ کیا کہ وہ اپنی انگوٹھی میں ایک مسافر کو جہاز کے اندر بیٹھا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ اور ان کے ساتھ میں ایک ڈاکٹر ان کی مرہم پٹی کر رہا ہے

ایک مقامی فقیر نے اپنی اوقات کے مطابق ایک مسافر کو ایک گوجر کے گھر میں چپاتیاں کھاتے ہوئے دیکھ لیا۔ غرض مصیبت زدوں کی مجبوریوں اور ان کی ضعیف الاعتقادی کا خُوب خُوب فائدہ اُٹھا کر ''خدا کے دوستوں'' نے ''خدا کے بندوں'' کا وہ مذاق اُڑایا کہ چراغ بیگ کو بے طرح اقبالؒ کا یہ شعر یاد آنے لگا۔

خداوندا!

یہ تیرے سادہ دل بندے کِدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیّاری ہے ، سُلطانی بھی عیّاری

یہ وہ مقام تھا کہ ان فقیروں، درویشوں اور جوتشیوں کی کرامات پر یقین رکھنے والے ضعیف الاعتقاد لوگ ان کی اصلیت اور حقیقت سے باخبر ہو کر ان سے ناطہ توڑ دیتے خدا کی خدائی میں مجذوبوں، فقیروں اور مہارشیوں کو شریک بنانے والے اپنی غلطی کو محسوس کر کے خدا کی وحدت اور اس کی مشیت پر ایمان لے آتے۔ لیکن ایسا نہیں ہوگا، یہ لوگ پھر ان ہی نام نہاد درویشوں کی چوکھٹ پر اپنا ماتھا رگڑتے ہوئے نظر آئیں گے۔ یہ پھر مشیت ایزدی کو بدلنے کے لئے ان ہی مہارشیوں کا سہارا لینے کے لئے دربدر پھریں گے۔ اس لیے کہ ضعیف الاعتقادی کا پہلا وار عقل سلیم پر ہوتا ہے۔

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے :-

آج سے چند ماہ قبل جموں کے باشعور حُب الوطن اور دُور اندیش ٹرانسپورٹروں نے اقوام متحدہ میں سید میر قاسم کی اعلیٰ کارکردگی کو خراج تحسین

ادا کرتے ہوئے ان کی خدمت میں ۷۵ ہزار روپے ضرب ڈبل کی رقم پیش کی۔ ریاستی جن سنگھ نے دعویٰ کیا کہ یہ رقم ڈیفنس فنڈ کے نام پر جمع کی گئی تھی اور اسی مقصد کے لئے قاسم صاحب کو پیش کی گئی۔ موجودہ حکومت کے وزیر تردید شری ترلوچن دت نے فوری طور پر ان الزامات کی تردید کی۔ اور یہ دعویٰ کیا کہ ٹرانسپورٹروں نے اپنی مرضی سے بقائمی ہوش و حواس یہ رقم کانگریس کو دی تھی۔ رقم پیش کرنے والے ٹرانسپورٹروں نے اس سلسلے میں کانگریسی موقف کی حمایت کی ہے۔ چراغ بیگ کو خوشی ہے کہ جموں کے ٹرانسپورٹروں نے جن سنگھی الزامات کی قلعی کھول کر کانگریس کے تئیں اپنی وفاداری اور قاسم صاحب کے تئیں اپنی عقیدت کا مظاہرہ کرنے میں دیر نہیں کی۔ لیکن رہ رہ کے یہ سوال ذہن میں اُبھرتا ہے کہ ۴۰ لاکھ کی آبادی میں سے صرف ٹرانسپورٹروں کو کانگریس سے یہ والہانہ عقیدت کیوں ہوگئی ہے۔ اس سے قبل سرینگر میں بھی ٹرانسپورٹروں نے قاسم صاحب کو عصرانے دئے اور ان کی خدمات کو سراہا۔ ٹرانسپورٹروں اور کانگریس کے اس اتحاد اور اشترک باہمی سے بڑی بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں اور پچھلے دنوں ریاستی اسمبلی میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے دانائے دھر وزیر شری درگا پرشاد در نے کہا کہ ٹرانسپورٹروں نے اپنی مرضی سے کانگریس فنڈ میں چندہ دیا ہے۔ ڈی، پی صاحب کو یہ بات ضرور معلوم ہوگی کہ ہر رشوت دینے والا اپنی مرضی سے رشوت دیتا ہے بلکہ بعض اوقات منت سماجت کر کے بھی رشوت لینے پر آمادہ کرتا ہے۔ اس لئے بحث اس بات پر نہیں ہے کہ انہوں نے یہ چندہ اپنی

مرضی سے دیا ہے یا اُن سے زبردستی وصول کیا گیا ہے۔سوال یہ ہے کہ چندہ دیا کیوں گیا ہے؟ یہ ٹرانسپورٹر تو بڑے ظالم ہوتے ہیں۔اپنی ایک ایک پائی کا حساب رکھتے ہیں۔اس لئے کانگریس کو دی ہوئی ۷۵ ہزار روپے کی رقم کے عوض میں ان کے ساتھ کیا معاہدے طے ہوئے ہیں۔یہ جاننے کے لئے جنتا بے چین ہے۔اس سوال کا اگر ڈی پی صاحب یا قاسم صاحب کے پاس کوئی جواب ہو، تو عرض ہے کہ ایک بیرنگ خط میں چراغ بیگ تک پہنچا دیجئے تا کہ حکومت یعنی کانگریس اور ٹرانسپورٹرس کی اس دل لگی کا مزید احوال معلوم ہو سکے۔

سخت ضرورت ہے:-

آل جموں و کشمیر ولداخ محاذ رائے شماری کو ایک صاحب صدر کی سخت ضرورت ہے۔درخواست دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔خواہشمند اصحاب خود ہی اپنی صدارت کا اعلان کر دیں۔

صاحب صدر کا کم از کم میٹرک پاس ہونا ضروری ہے۔مخصوص حالات میں اس قید کو نرم کیا جا سکتا ہے لیکن صاحب صدر کا صاحب دستخط ہونا بے حد ضروری ہے۔تجربے کی کوئی قید نہیں۔ماضی کی جانچ پڑتال نہیں کی جائیگی۔لیکن مستقبل کی بھی کوئی ضمانت نہیں دی جائیگی۔تنخواہ حسب منشأ دی جائیگی۔لیکن مہنگائی الاونس کا کوئی وعدہ نہیں کیا جا سکتا۔صاحب صدر ہونے کے بعد استعفیٰ کسی حالت میں بھی قبول نہیں کیا جائے گا گرفتار ہونے کی صورت میں فیملی کو نظر بندی الاونس دیا جائے گا جس کی کوئی رسید نہیں لی

جائے گی۔

۱/ آل کشمیر پولٹیکل کانفرنس کے رہنماؤں کو کچھ ''عوام'' کی ضرورت ہے جو دفتر میں منعقد ہونے والے جلسوں میں ان کی تقریریں سنیں۔ تقریریں سننے کا معقول معاوضہ دیا جائے گا۔ ایسے سامعین کو ترجیح دی جائے گی جو خاموشی سے تقریر سننے کی اہلیت رکھتے ہوں۔

۲/ بخشی صاحب کو چند ایسے تجربہ کار نعرہ بازوں کی ضرورت ہے جو ان کی سرینگر تشریف آوری پر ''آ گیا جی آ گیا'' کے نعرے بلند کر سکیں۔ معاوضہ اور مشاہرہ ان کی خدمات دیکھ کر ہی دیا جائے گا۔

۳/ مقامی جن سنگھ کو ایک ایسے لیڈر کی سخت ضرورت ہے جس کا کنبہ دس بیس افراد پر مشتمل ہو۔ تا کہ وقت ضرورت لیڈر موصوف کا کنبہ جن سنگھ کی مجلس عاملہ کا کام دے سکے۔

☆

مارچ ۱۹۶۶ء

۹

محکمۂ افزائش جرائم :-

اُردو کے مشہور شاعر اور یو، پی ، ہائی کورٹ کے سابق جج شری آنند نرائن ملاّ نے آج سے چند سال قبل ایک اپیل کا فیصلہ سُناتے ہوئے کہا تھا کہ یو، پی کی پولیس ملک میں بدمعاش اور جرائم پیشہ افراد کا سب سے منظّم گروہ ہے پولیس اور یو، پی سرکار کی طرف سے جسٹس ملاّ کی اس بے رحم حقیقت بیانی کے خلاف بڑا اوویلا ہوا۔ لیکن ملاّ صاحب ہمارے ہاں کے رروایتی ملاّ نہ تھے۔ جو دباؤ یا لالچ کی وجہ سے اپنا فتویٰ بدلتے۔ ان کا فتویٰ ان کے سال ہا سال کے تجربے کا نچوڑ تھا۔ اور وہ اپنی بات پر اڑ گئے۔ اپنے یہاں کی پولیس کی ”کارکردگی“ اور ”ایمانداری“ کو دیکھتے ہوئے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مُلاّ صاحب نے جو بات یو، پی پولیس کے بارے میں کہی تھی۔ اس کا اِطلاق حرف بحرف ریاست جموں وکشمیر کی پولیس پر بھی ہوتا ہے۔ چراغ بیگ اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے کی بناء پر یہ دعویٰ کرتا ہے اگر حکومت ریاست میں جرائم کی تعداد میں کمی کرنے کی خواہش مند ہو تو

اُسے سب سے پہلے جرائم پیشہ افراد کے سب سے منظّم گروہ پولیس کو ختم کرنا چاہئے۔ قانون اور انصاف کا ''محکمہ'' دراصل لاقانونی اور ناانصافی کا سب سے موثر اور متحرک ادارہ ہے۔ قانون شکنی کی ترغیب ہماری پولیس دیتی ہے۔ مجرم کو قانون کی گرفت سے بچانے کا وسیلہ ہماری پولیس بنتی ہے۔ محکمہ عدلیہ کا تقدس اور وقار خاک میں ملانے کا ذریعہ ہماری پولیس ہے بدمعاش کی راز دار ہماری پولیس ہے۔ قمار بازی کے اڈوں کی حفاظت ہماری پولیس کرتی ہے۔ چکلوں اور کنجر خانوں کا کاروبار ہماری پولیس کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ غرض ہماری پولیس ہمارے معاشرے کی غلاظت اور عفونت کی سب سے بڑی علامت ہی نہیں، اس کی تطہیر اور اس کے علاج کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ بھی ہے۔ ابھی حال ہی میں ریاستی اسمبلی میں وزیر پولیس شری ڈی، پی در نے پولیس کے لئے حد سے بڑھے ہوئے اخراجات کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا کہ جس طرح ایک شاندار باغ کی خوبصورتی اور پھولوں کی خوبصورتی کے لئے ہمیں اس کی سجاوٹ، سج دھج اور سلامتی کے لئے کافی رقم خرچ کر کے جنگلہ بھی تعمیر کرنا پڑتا ہے اسی طرح عوام کی سلامتی اور تحفظ کے لئے پولیس پر بھی زیادہ اخراجات برداشت کرنا ضروری ہے۔

شری در شاید بھول گئے ہوں کہ جن دنوں ڈیموکریٹک سیلون میں ریاستی پولیس ان کی حجامت بنایا کرتی تھی۔ ان دنوں بخشی غلام محمد بھی پولیس کے اخراجات کے لئے عوام کی سلامتی کا ہی جواز پیش کیا کرتے تھے۔ صوبائی کانگریس کے بخشی رشید عُرف میر لسجن کی کھوپڑی بھی اسی پولیس نے توڑی

تھی اور چادر چُرانے کا مقدمہ بھی اسی پولیس کے ہاتھوں مُرتب ہوا تھا۔ اب جو پولیس پر مزید اخراجات برداشت کرنے کا اعلان ہوا ہے تو معلوم نہیں کتنے معزز شہریوں کی کھوپڑیوں میں کھجلی ہونے لگی ہوگی۔ ڈی، پی صاحب کی خدمت میں تو نہیں لیکن شری، ایل، ڈی، ٹھاکر اور شری ڈی، این، کول کی خدمت میں عرض ہے کہ شہر کی کئی پولیس چوکیوں کے سربراہ بدمعاشوں کے راز دار اور قمار بازوں کی ''تجارت'' میں برابر کے شریک ہیں...... اگر آپ نے جلد اس طرف توجہ نہیں کی، تو آپ کی شہرت بھی اسی طرح خطرے میں پڑ جائے گی۔ جس طرح چراغ بیگ کی زندگی۔

ڈبل ترقی:-

تحریک حریت کے ایک بہت ہی پُرانے لیڈر شری عبدالغنی ترالی کے بارے میں مشہور ہے کہ بخشی صاحب کے دورِ اقتدار میں جب وہ وزیر مملکت تھے۔ تو اکثر اپنے مہمانوں کی تواضع نمکین چائے اور ''ستو'' سے کیا کرتے تھے، اس روایت کے ذکر سے ان کی ''کنجوسی'' اور ''مکھی چوسی'' کی بجائے ان کی سادگیٔ طبع اور شرافت نفس کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔ وہ غالباً پہلے ''دیہاتی'' وزیر تھے۔ جو وزیر ہونے کے باوجود اپنے ''دیہاتی'' ہونے پر فخر کرتے رہے پچھلے دنوں ریاستی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے اپنے دیہاتی لب و لہجے میں ایک بڑی معصوم سی شکایت کی۔ اور چراغ بیگ کو ان کی سادگی اور معصومیت پر بے طرح پیار آ گیا۔ ترالی صاحب انتظامیہ میں بڑھتی ہوئی رشوت ستانی اور بدعنوانی کا ذکر رہے تھے۔ تو انہوں نے اپنا

ایک ذاتی تجربہ بھی بیان کیا۔ اس تجربے کا خلاصہ یہ ہے کہ نائب تحصیلدار کے خلاف انہوں نے متعلقہ حکام سے یہ شکایت کی کہ وہ نا اہل اور رشوت خور ہے۔ اس شکایت کا نتیجہ یہ ہوا کہ نائب تحصیلدار موصوف کو ترقی دے کر تحصیلدار بنایا گیا۔ اب قارئین ''آئینہ'' خود ہی بتائیں کہ ترالی صاحب کے بھولے پن اور ان کی معصومیت کا کوئی جواب ہے؟ ان کا خیال تھا کہ نائب تحصیلدار کے خلاف تحقیقات کی جائے گی۔ اور اگر شکایت درست ثابت ہو، تو اُسے سزا دی جائے گی۔ یعنی وہ رہ تو رہے تھے، کشمیر میں اور خواب دیکھ رہے تھے لندن کے...... بچارے ترالی صاحب کو بھی نہیں معلوم کہ اس سر زمینِ بے آئین میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے رشوت ستانی، بے ایمانی اور ضمیر فروشی کے الزام میں ماخوذ ہو جانا...... اگر ترالی صاحب سمجھ دار ہوتے، تو نائب تحصیلدار کے خلاف بے ایمانی کی شکایت کرنے کی بجائے خود بھی تھوڑی سی بے ایمانی کرتے، اور اسمبلی میں اپنی بے کسی اور بے بسی کا رونا رونے کی بجائے ٹریجری بنچوں پر بیٹھے اپنے نائب تحصیلداروں اور تحصیلداروں کی مدافعت کرتے۔ یہاں کون ہے جسے اس کی بے ایمانی، رشوت ستانی اور ضمیر فروشی کا معقول صلہ نہیں ملا۔ جو سرکاری ملازم تھا۔ اُسے ترقی پر ترقی دے کر اس کے گناہوں کا ''کفارہ'' ادا کیا گیا۔ جو فرقہ پرست تھا۔ اُسے کانگریس کی آغوش میں چھپا کر قوم پرستی کا سرٹیفکیٹ دیا گیا۔ آپ بچارے نائب تحصیلدار کے پیچھے کیوں پڑ گئے۔ سرکاری گیلری میں بیٹھے ہوئے ان افسروں کی طرف دیکھ لیا

ہوتا، جن کے کردار کی سیاہی ان کے چہروں پر اُبھر آئی ہے اور جو صادق کی صالح ایڈمنسٹریشن کی مجسم پیروڈی نظر آرہے ہیں۔

چراغ بیگ کو ترالی صاحب سے ضرور ہمدردی ہے لیکن اس سے زیادہ ہمدردی اس نائب تحصیلدار سے ہے جسے شکایات کی بناء پر صرف تحصیلدار بنایا گیا۔ عام طور پر ایسے خوش قسمتوں کو ڈبل ترقی دی جاتی ہے اُسے تو سیدھا ڈپٹی کمشنر بنا دینا چاہئے تھا۔

اندیشہ ہائے دور دراز:-

سرینگر میونسپلٹی کی طرف سے منظّم کی گئی ''ملاوٹی نمائش'' کے خلاف چراغ بیگ کو متعدد شکایات ہیں۔ سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ سرینگر میونسپلٹی نے پورے شہر کا صبر و قرار اور اطمینان چھین لیا ہے۔ شہر کے لوگ خدا کی خدائی پر توکل کر کے دودھ ملائی کھا رہے تھے کہ میونسپلٹی نے اعلان کر دیا کہ دودھ میں پانی اور ملائی میں بُرائی ہے۔ شہر کا بچہ بچہ جانتا تھا کہ وہ جو دودھ پی رہا ہے اس میں دودھ کم اور پانی زیادہ ہے لیکن اس نے من جملہ اور آفات سماوی کی اس حقیقت کو بھی زندگی کے ایک جز کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا۔ میونسپلٹی نے دودھ میں پانی کی دریافت کا اعلان کچھ اس انداز سے کیا کہ جیسے کسی کولمبس نے کوئی نیا امریکہ دریافت کیا ہو۔ بھئی، دودھ میں پانی ہے، یہ تو ہم بھی جانتے ہیں۔ اس کے لئے قطعی طور پر کسی نمائش کی ضرورت نہ تھی۔ ہلدی میں اینٹیں، گھی میں آلو، کھانڈ میں ایمونیم سلفیٹ اور چائے میں پتے ہیں۔ یہ ہم پہلے بھی جانتے تھے۔ اور اب بھی جانتے ہیں۔ اس نمائش نے

صرف آئینہ دکھا کر ہماری بدصورتی کے احساس کو گہرا کر دیا ہے۔ میں اسے نری اذیت کوشی Sadism سمجھتا ہوں۔ جس مرض کو کائی علاج نہیں اسے صحت کی علامت سمجھ کر قبول کر لینا چاہیئے۔ ہم تو آنکھیں بند کر کے ملاوٹی دودھ، گھی، ہلدی، چائے، شہد اور شکر کھا لیتے تھے، اب جب بھی چائے سامنے آتی ہے، میونسپلٹی کی نمائش آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ گھی کھاتا ہوں تو اس سے آلوؤں کی خوشبو آنے لگتی ہے۔ کھانا کھانے بیٹھتا ہوں تو سالن میں سے پِسی ہوئی اینٹوں کی چر چر سنائی دیتی ہے مرچوں کا بڑا شوقین تھا۔ لیکن اب مرچیں دیکھ کر کانپ اُٹھتا ہوں کہ نہ معلوم ان کے ساتھ کون سے زہریلے رنگ ملے ہوئے ہوں۔ غرض دِل کا اطمینان لٹ گیا ہے اور لوٹنے والے ہیں۔ سرینگر میونسپلٹی کے اہلکار۔

سرینگر میونسپلٹی کے اہلکاروں سے مجھے ایک اور بات بھی کہنا ہے جو غالباً ان کے ذہن میں نہیں آئی ہے لیکن جو قابل توجہ ہی نہیں قابل غور بھی ہے۔ ہم سال ہا سال سے ملاوٹی خوراک کھاتے آئے ہیں۔ اس سے پہلے ہمارے آباواجداد بھی یہی خوراک کھا کھا کے پلے، بڑھے اور مر گئے۔ ہم بھی ملاوٹی غذا اور ہوا کھا کر جوان ہو گئے ہیں۔ ہمارے جسم، ہاضمے کا نظام اور دیگر کل پُرزے ملاوٹی خوراک سے اتنے ہم آہنگ ہو گئے ہیں کہ اب اگر اتفاق سے اِنہیں چند دن کے لئے خالص خوراک دی جائے۔ تو اس بات کا زبردست اندیشہ ہے کہ ہمارے قواء جسمانی اس نئی تحریک کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کر دیں اور اس طرح ہم طرح طرح کی اعصابی اور جسمانی

عارضوں میں مبتلا ہو جائیں۔ میرا خیال ہے کہ میونسپلٹی کو ملاوٹ کے خلاف مہم شروع کرنے سے پہلے کچھ شہریوں پر خالص خوراک کا تجربہ کرنا چاہیے تھا تاکہ ان اندیشہ ہائے دُور دراز کا قبل از وقت تدارک کیا جاتا...... نمائش سے جائز طور پر ایک اور اندیشہ بھی لاحق ہو گیا ہے کہ اس سے ملاوٹ کرنے والوں کی معلومات میں کافی قیمتی اضافے بھی ہو سکتے ہیں۔ چراغ بیگ نے نمائش دیکھنے والے ہجوم میں کچھ پیشہ ور ''ملاوٹیوں'' کو نمائش کا بڑے غور سے مطالعہ کرتا ہوا بھی دیکھ لیا ہے۔

☆

اگست ۱۹۶۵ء

۱۰

چراغ بیگ اور مدیر ''آئینہ'' کو پچھلے ایک سال کے دوران متواتر ایسے خطوط ملتے رہتے ہیں جن میں سے ان کی ذات، شخصیت اور نظریات کو ہدفِ ملامت بنا کر انہیں اپنا رویہ بدلنے کا مشورہ دیا جاتا رہا ہے، بعض اوقات مکتوب نگار حضرات ''منتخب'' گالیاں دے کر اپنے دِل کی بھڑاس نکالتے ہیں اور کبھی کبھی کوئی ''سرپھرا'' جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دے کر اپنے فرائض سے سبکدوش ہوتا ہے۔ روزانہ کی ڈاک سے ملنے والے خطوں کا ایک انتخاب ''آئینہ'' کے سالنامے میں شائع کیا گیا تھا۔ لیکن یہ انتخاب چونکہ بڑا ہی مہذب اور متعدل تھا۔ اس لئے ان ''تنقیدی خطوط'' کے تنقیصی کردار کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہے جن کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ پچھلے کئی ہفتوں سے زبان و بیان کے ان ''شاہکاروں'' کا لہجہ زیادہ تلخ، دھمکی آمیز اور جارحانہ ہو گیا ہے۔ اور قیاس غالب ہے کہ مستقبل قریب میں غیض و غضب کی یہ کیفیت جنوں کی حد تک پہنچ جائے گی۔ ہم خدائے قدوس کی بارگاہ میں دست بدعا ہیں کہ مزاجِ یار کی برہمی میں کچھ افاقہ ہو۔

اور ؎

''یا دامنِ یزداں چاک یا اپنا گریباں چاک'' کی منزل سے پہلے ہی عقل، توازن اور رواداری کو اپنا اصلی مقام مل جائے۔

چراغ بیگ کے ایک تجربہ کار اخبار نویس دوست کا کہنا ہے کہ اس قسم کے دلچسپ، فکر انگیز اور اکثر اوقات اشتعال انگیز خطوط کا ہر ایڈیٹر کی ڈاک میں ہونا، اخبار کی مقبولیت اور اس کے خریداروں میں اضافے کی واضح علامت ہے۔ اور جب اس قسم کے خطوط کا سلسلہ بند ہو جائے تو صاحبِ اخبار کو اخبار بند کر کے کسی گلی کے نکڑ پر پان کی دُکان کھول کر بیٹھ جانا چاہئے۔ بات غالباً صحیح ہے۔ کیونکہ اخبار نویس جھوٹ بول سکتا ہے اس کا تجربہ جھوٹ نہیں بولتا۔ اور انہوں نے یہ بات اپنے تجربے کی بنا پر کہی ہے۔ لیکن اس اطمینان اور یقین دہانی کے بعد بھی چراغ بیگ کو کچھ پریشانیاں لاحق ہیں۔ ان پریشانیوں کا اُن دھمکیوں سے کوئی تعلق نہیں ہے جن کی رُو سے چراغ بیگ کی رُوح کو ان کے جسم کی قید سے آزاد کر کے ہوا میں پرواز کا حق دیا جانے والا ہے۔ ان کا تعلق ان فی البدیہہ قسم کی مغلظات سے بھی نہیں جو چراغ بیگ کی خاطر تواضع کے لئے وضع کی جاتی ہیں۔ ان کا سلسلہ اس تنبیہہ سے بھی نہیں ملتا، جس کی رُو سے ''آئینہ'' کا بائیکاٹ کر کے میری اقتصادی حالت کو تباہ و برباد کرنے کا منصوبہ زیرِ غور ہے۔ قتل کی دھمکی سے انسان کو اپنی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ گالیوں کی وضع قطع سے مکتوب نگار کی ذہنی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اخبار کا بائیکاٹ اخبار کی مقبولیت میں اسی

طرح اضافے کا باعث ہوتا ہے جس طرح ''صرف بالغوں کے لئے'' والا سٹیفکیٹ فلم کی غیر معمولی مقبولیت اور شہرت کی ضمانت بن جاتا ہے تو پھر آپ لوگ پوچھیں گے کہ چراغ بیگ کو پریشانی کا ہے کی ہے؟

چراغ بیگ کی پریشانی اس کی ذات سے نہیں بلکہ پورے شش جہت سے تعلق رکھتی ہے۔ ان دھمکی آمیز اور سبق آموز خطوط کو پڑھ کر چراغ بیگ کو اپنے مستقبل سے نہیں بلکہ اُردو زبان کے مستقبل کے متعلق اندیشے لاحق ہوجاتے ہیں، ان ''شاہ پاروں'' کی زبان اتنی دلچسپ اور نادر بلکہ ''عجیب الخلقت'' ہوتی ہے کہ خط کے مضمون سے زیادہ اس کی عبارت آرائی اور جذبے سے زیادہ جذبات کی ہنگامہ آرائی باعثِ توجہ و تفنن بن جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے یہاں اُردو کی کوئی نئی گریمر وضع کی گئی ہے جس کا چراغ بیگ اور مدیر ''آئینہ'' کو علم ہی نہیں الفاظ کے انتخاب میں وہ جدّت برتی جاتی ہے کہ کسی خفیہ ڈکشنری کے وجود کا گمان ہونے لگتا ہے۔ جملوں کی ترکیب، فعل کے استعمال اور تذکیر و تانیث میں اُردو سے زیادہ انگریزی کا تتبع کیا جاتا ہے۔ جذبات کی شدت کے اظہار کے لئے سب سے موزوں پیرایہ ماں بہن کی گالی سمجھا جاتا ہے (حالانکہ اس سے بہتر اسالیب بیان اُردو میں موجود ہیں) بہر کیف اپنے غیض و غضب کے اظہار کے لئے بچاری بدنصیب اُردو سے انتقام لیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ زبان بھی چراغ بیگ ہی کی طرح معصوم ہے۔ چراغ بیگ اپنے مکتوب نگاروں، نقادوں، نکتہ چینوں اور دُشمنوں سے صرف ایک درخواست کرتا ہے وہ یہ کہ گالیوں کے استعمال میں

بھی زبان کی صحت کا خیال رکھیں۔ گالیاں اختراع کرتے وقت زبان کے مزاج، گرامر کی قید اور لہجے کی نفاست نہ سہی، لیکن انداز کی نزاکت کو ملحوظ خاطر رکھیں۔ ایسا کرنے سے ان کی تنقید زیادہ موثر اور ان کی تنقیص زیادہ تکلیف دہ بن سکتی ہے ورنہ زبان کی بوالعجبیاں ان کے جذبات کی شدّت کو زائل کرنے کا موجب بنتی ہیں۔

ان خطوط کے بارے میں ایک اور دلچسپ بات کا تذکرہ بھی دلچسپ سے خالی نہ ہوگا۔ خط کے لہجے اور جذبات کی گھن گرج سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ کوئی سرفروش، بہادر زمین و آسمان کو پاؤں تلے روندتا ہوا آگے بڑھتا آرہا ہے۔ اُسے دُنیا میں کسی چیز کی پروانہیں۔ اور وہ کسی سے خوف نہیں کھاتا۔ لیکن خط کے آخر میں یہ بھرم کھل جاتا ہے اور مکتوب نگار اپنے اصلی رُوپ میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ اکثر ایسے خطوط میں مکتوب نگار کا پتہ تو خیر دُور کی بات تھی اس کا نام بھی نہیں ملتا۔ زیادہ تر مکتوبات فرضی ناموں سے لکھے جاتے ہیں۔ یوں بزدلوں کی طرح پیٹھ پیچھے گالیاں دینا اور بزعمِ خود بہت بڑا کارنامہ انجام دینا قابلِ نفرت نہیں، قابل رحم ہے اور اسی لئے چراغ بیگ اپنے ان مکتوب نگاروں سے دو ایک باتیں سنجیدگی سے کرنا چاہتا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ ان مکتوب نگاروں کی اکثریت کالجوں اور سکولوں میں پڑھنے والے اُن نوجوان طالب علموں کی ہے جن کو سیاسی نظریات اور مذہبی اعتقادات اپنے والدین سے ورثے کے طور پر ملتے ہیں۔ ان کی نشو ونما ایک ایسے ماحول میں ہوتی ہے جس میں آباد اجداد کے فرسودہ خیالات اور

بندھے ٹکے نظریات کو حرفِ آخر سمجھا جاتا ہے۔اسی لئے جب یہ نوجوان کسی سر پھرے کو ان خیالات اور نظریات سے اختلافات کرتا ہوا پاتے ہیں تو وہ اپنے معتقدات کا تجزیہ کرنے کی بجائے اختلاف کرنے والے کو گردن زدنی قرار دیتے ہیں۔ میں نے ابھی کہا ہے کہ ان نوجوانوں کی حالت قابلِ نفرت نہیں بلکہ قابلِ رحم ہوتی ہے۔ ان کی ذہنی ساخت ،فکری نشو ونما اور ان کا گھریلو ماحول انہیں ایک سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔

انہیں اپنے نظریات کی صحت پر ایسا ایمان کامل ہوتا ہے جو انہیں کسی دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی اجازت ہی نہیں دیتا۔اسی طرح جہالت کا نام اعتقاد اور اِجتہاد کا نام کُفر رکھ دیا جاتا ہے۔ چراغ بیگ سے اختلاف رکھنے والوں کی خدمت میں یہ گذارش ہے کہ چراغ بیگ اپنے نظریات اور معتقدات سے اختلاف رکھنے والوں کو بے حد عزیز رکھتا ہے۔ چراغ بیگ آپ کو اختلاف کرنے کا حق دِلوانے کے لئے اپنی زندگی قربان کرنے کے لئے تیار ہے۔ کیونکہ اختلاف اور تشکیک کی منزل سے گذرنے کے بغیر اعتقاد اور ایمان کی منزل تک پہنچا ہی نہیں جاسکتا۔لیکن اختلافِ رائے اور نظریات کے تضاد کو حل کرنے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ اپنے مخالف کو گالیاں دے کر (اور وہ بھی گم نام خطوط کے ذریعے) اپنے فرائض سے سبکدوش ہو جاؤ اگر آپ کو واقعی اس بات سے دلچسپی ہے کہ ہم اپنے ''گمراہ کُن'' اور ''غیر صحت مند'' نظریات کو چھوڑ کر راہ راست پر آجائیں تو اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ آپ ہمیں گالیاں دینے کی بجائے اپنے نقطۂ نظر کو واضح

کردیجیے۔ ہمارے خیالات اور نظریات پر صحت منداور تعمیری نکتہ چینی کیجیے ۔ہمیں گالیاں دینے سے آپ ہمارے نظریات اور اعتقادات کو زیادہ راسخ اور مضبوط بناتے ہیں۔اس سے ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے پاس کوئی دلیل، کوئی منطق، کوئی جواز نہیں۔اوراسی لئے آپ اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لئے گالیوں اور دھمکیوں پر اُتر آتے ہیں۔اور اگر آپ ہمارے خیالات کو ،ہم کو، ہماری تحریر کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے تو پھر آپ ہمیں گالیاں دینے میں اپنا پیسہ اور وقت کیوں برباد کرتے ہیں؟

چراغ بیگ ان تمام بزدِل مکتوب نگاروں کو صلائے عام دیتا ہے جو گمنام اور فرضی ناموں سے خط لکھ لکھ کر مجھے راہِ راست پر لانا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے چہرے نقاب اُتار کر سامنے آجائیں اور کھل کر بات کریں اور اپنے اعتراضات اور خدشات کے بارے میں بات کریں۔ میں اُنہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں اُن کی آراء پر سنجیدگی سے غور کر کے اُن پُرعمل کرنے کی بھرپور کوشش کروں گا۔

☆

دسمبر ۱۹۶۵ء

۱۱

نیا قانون:-

۹ مئی ۱۹۶۵ء کو ریاست جموں و کشمیر کی جمہوری سرکار نے صحافت کے معیار کو بلند کرنے کی غرض سے سرینگر کے دس ہفتہ وار اخبارات کو یہ مُفت قانونی مشورہ دیا کہ وہ تا حکمِ ثانی اخبار شائع کرنے کی زحمت گوارا نہ کریں۔ یہ ''مشورہ'' چونکہ مقبولِ عام قانون یعنی ڈی، آئی، آر کے تحت دیا گیا تھا، اس لئے مالکان و مدیرانِ اخبارات کو اسے قبول کرنے کے سِوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ پورے سات ماہ کے بعد معاصِر ''ہمدرد'' کو دوبارہ شائع ہونے کا حکم دیا گیا ہے لیکن باقی نو اخبارات کو ملک کی سلامتی اور سالمیت کے لئے بدستور خطرہ تصّور کر کے اشاعت کا پروانہ دینے سے احتراز کیا گیا ہے۔ خداوندانِ اقتدار کو معاصر ''ہمدرد'' کی وہ کونسی ادا بھا گئی ہے جس سے خوش ہو کر انہوں نے اسے دوبارہ اشاعت کی اجازت سے سرفراز کیا ہے، یہ ابھی تک معمہ ہے اور جب تک ہمارے سروں پر اس نااہل حکومت کا سایہ قائم ہے، بہت سے ایسے ہی لاینحل معمے ظہور میں آتے رہیں گے! لیکن معاصر ''ہمدرد'' نے حکومت کے اس خوشگوار فیصلے کے لئے ''وزیرِ وزارت'' سید قاسم اور وزیر اطلاعات شری علی محمد طارق کا شکریہ ادا کر کے اپنے ہم عصروں کی کسی حد تک

رہنمائی کی ہے۔ یعنی اخبارات کی دوبارہ اشاعت کی اجازت چاہتے ہو تو قاسم صاحب کی چوکھٹ پر ماتھا رگڑو! اور طارق صاحب کی خوشامدیں کرو کہ یہی اس ریاست کا قانون اور یہی اس سرزمین کا انصاف ہے۔ معاصر ''زمیندار'' معاصر ''رہبر'' اور معاصر ''رہنما'' نے ہندوستان کا وہ آئین پڑھا ہوگا جس کی رُو سے ہندوستان کے شہریوں کو تحریر و تقریر کی آزادی حاصل ہے۔ اس لئے وہ اپنے آئینی حقوق کی تلاش میں سرگرداں پھر رہے ہوں گے۔ ان بچاروں کو ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوگا کہ ریاست پر ایک نیا مسودہ قانون لاگو ہے اور اس کا عنوان ہے سید میر قاسم...... اس سرزمین بے آئین میں زندہ رہنا چاہتے ہو تو ان کی بارگاہ میں حاضری دینے کی عادت ڈالو۔ کیونکہ اخبارات کی اشاعت کا حق یہاں کے شہریوں کا پیدائشی حق نہیں، سید میر قاسم اور جناب علی محمد طارق کی عنایت ہے۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ ایک ہی قانون کے تحت بند کئے گئے اخبارات میں سے ایک اخبار کو شائع ہونے کی اجازت دی جائے اور باقی اخبارات کو اس ''عنایت'' سے محروم رکھا جائے!

نظامِ تعلیم میں مشیروں کی اہمیت:-

حکومت کے تعلیمی اصطبل میں ایک سے ایک نادر نمونہ موجود ہے۔ پچھلے سال صادق صاحب نے دہلی میں چراغ لے کر ایک اور نادرِ روزگار نمونے کو ڈھونڈ ھ نکالا۔ نام میرزا محمود بیگ، کام نامعلوم، عہدہ ایڈوائزر یعنی مشیر! بیگ صاحب جب شہر میں لائے گئے تو چراغ بیگ نے خاندانی تعلق کی بناء پر ایک کھلی چھٹی لکھ کر موصوف کو آنے والے خطرات سے آگاہ کیا۔

لیکن جب تنخواہ بھاری بھر کم ہو تو آدمی خطرات کی پروا نہیں کرتا۔ پورے دو سال تک محمود بیگ اور ریاستی عوام کو اس بات کا پتہ نہ چل سکا کہ آخر ان کا کام کیا ہے۔ آخر بیگ صاحب کی ذہانت کام کر گئی۔ اور انہوں نے پورے دو سال کی کمی پوری کر دی۔ پچھلے ہفتے انہوں نے احکامات جاری کر دئے کہ گذشتہ دو ایک سال میں اُستادوں کی جتنی تقرریاں ہوئی ہیں وہ چونکہ ان کے مشورے سے نہیں ہوئی ہیں اس لئے ان سب کو کالعدم قرار دیا جاتا ہے۔

زندہ باد بیگ صاحب!......آپ نے افضل بیگ اور چراغ بیگ دونوں ہی کی لاج رکھ دی۔ اگر آپ نے اس نازک وقت میں یہ کارنامہ انجام نہ دیا ہوتا۔ تو اس بات کا زبردست امکان ہے کہ ایڈوائزری کے عہدے کو غیر ضروری قرار دے کر ختم ہی کر دیا جاتا۔ لیکن آپ نے عینِ وقت پر اپنی موجودگی کو انتہائی اہم اور مفید ثابت کر دیا ہے۔ رہی بات ان سینکڑوں اُستادوں کی، جو آپ کی ادائے دلبری کا شکار ہو کر اپنی قسمت کو رو رہے ہیں، تو رفتہ رفتہ ان کی سمجھ میں یہ بات آ ہی جائے گی کہ وزارت تعلیم میں اس قسم کے حادثات ناگزیر ہیں۔ کیونکہ تعلیم زندگی کا ایک متحرک اور جاندار شعبہ ہے۔ اور اس میں کسی قسم کا جمود پیدا ہونے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

چراغ بیگ اس اُلجھن میں مبتلا ہے کہ مشیرِ تعلیم کو ان کی اعلیٰ کارکردگی کے لئے کون سا قومی اعزاز دیا جائے۔ کیونکہ انہوں نے محکمہ تعلیم سے ''غیر پسندیدہ عناصر'' کو نکال باہر کر کے وہ کچھ کر دکھایا ہے جس کے لئے پوری قوم ان کی احسان مند ہے! سوال صرف یہ ہے کہ مزید دو برس کے بعد مشیرِ تعلیم

کی نگاہِ انتخاب کہاں جا کر ٹھہرتی ہے؟

محکمۂ تردید کا تازہ ترین لطیفہ :-

محکمہ لطیفۂ جات یعنی محکمہ اطلاعات سے متعلق ایک اعلیٰ سطح کا لطیفہ سُنیئے ......ایک اطلاع کے مطابق وزیر اعلیٰ خواجہ غلام محمد صادق بہ حیثیت مجموعی وزیر اطلاعات اور محکمہ اطلاعات کی کارکردگی سے خوش نہیں ہیں اور وہ محکمے کے انتظامی ڈھانچے میں کچھ اہم اور غیر معمولی تبدیلیاں کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اور وزیر اعلیٰ چونکہ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ اس لئے انہوں نے اپنی سمجھ بوجھ پر اعتماد کرنے کی بجائے محکمے کی از سر نو تنظیم کے لئے اپنی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کردی۔ جس میں شری منکت رائے چیف سیکرٹری اور شری جے، این زتشی کو بحیثیت ممبر کے لیا گیا۔ ایک اطلاع کے مطابق اس کمیٹی کی تشکیل کی اطلاع وزیر اطلاعات شری علی محمد طارق کو بھی نہیں دی گئی۔ لیکن طارق صاحب کے رقیبِ خصوصی غلام رسول کار کے ذریعے سے یہ سرکاری راز کانگریس کے آفیشل آرگن ''خدمت'' میں نمایاں طور پر شائع ہوا۔ ''خدمت'' کے ذریعے جب وزیر اطلاعات کو اس بات کی اطلاع ملی گئی کہ ان کی مملکت کی سرحدوں میں کچھ درانداز گھس آئے ہیں تو انہوں نے احتجاج کیا۔ اور وزیر اعلیٰ سے شکایت کی کہ جس بات کی اطلاع محکمہ اطلاعات کو نہیں، وہ اخبارات تک کیونکر پہنچی۔ صادق صاحب یعنی کہ وزیر اعلیٰ ایسے نازک مواقع پر اکثر مسکرایا کرتے ہیں اور قیاس غالب ہے کہ طارق صاحب کی شکایت پر وزیر اعلیٰ مسکرائے ہوں گے۔ اس کے بعد

ڈائریکٹر اطلاعات کو ہدایت ہوئی کہ اس خبر کی تردید کی جائے۔ ڈائریکٹر اطلاعات نے ادارہ ''خدمت'' میں شائع شدہ خبر کی تصدیق سے انکار کرتے ہوئے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ اس قسم کی خبر کانگریس کے آفیشل آرگن میں شائع ہوئی ہے۔ پھر آفیشل آرگن نے ایک کونے میں اس خبر کی ''تردید'' شائع کردی...... آپ پوچھیں گے کہ اس میں لطیفہ کیا ہوا...... جی ہاں! پہلے چراغ بیگ بھی یہی سوچ رہا تھا۔ پھر جب اُسے معلوم ہوا کہ محکمے کی از سرِ نو تشکیل کے لئے وزیرِ اعلیٰ کی صدارت میں واقعی ایک کمیٹی قائم ہوئی ہے تو اس ساری حکایت میں لطیفے کا سا تاثر پیدا ہو گیا۔ لیکن لطیفہ چونکہ محکمہ اطلاعات سے وابستہ ہے، اس لئے تیسرے درجے کا ہے۔ اس میں قصور چراغ بیگ کا نہیں، اس نامراد محکمے کا ہے!

ماہرینِ قانون کی اُلجھن:۔

کافی ہاؤس میں ایک بہت بڑے وزیر کے صاحب زادے سے مذاق کرنے کی پاداش میں ایک بہت ہی چھوٹے سرکاری ملازم کو پچھلے تین ماہ سے معطل کر دیا گیا ہے۔ چونکہ وزیروں کے صاحبزادوں سے مذاق کرنا رنبیر پینل کوڈ کی رُو سے جُرم قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس لئے سرکاری ملازم پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ وہ سرکاری اوقات میں کافی ہاؤس میں بیٹھا ہوا تھا۔ معطل شدہ سرکاری ملازم نے معافی مانگی کہ حضور آئندہ سے کبھی کافی ہاؤس کا رُخ نہ کروں گا۔ اب کی بار معاف کیجئے۔ لیکن تین ماہ سے زائد عرصہ گذر چکا ہے ۔ اس مظلوم کا معافی نامہ ابھی تک منظور نہیں ہوا ہے۔ دِقت یہ پیش

آرہی ہے کہ فردِ جرم میں ''کافی نوشی'' کا جرم مذکور ہے جب کہ اصلی جرم بہت بڑے وزیر کے صاحبزادے سے مذاق کرنے کا ہے۔ جب تک سرکاری ملازم اس بات کا اقرار نہ کرے کہ وہ آئندہ سے کسی وزیر کے صاحبزادے سے مذاق نہ کرے گا بلکہ ان کے قریب پھٹکنے کی حماقت بھی نہیں کرے گا۔ اس کے بحال کئے جانے کا کوئی امکان نہیں۔ قانونی ماہرین اس اُلجھن میں ہیں۔ کہ ملزم ایک ایسے جرم کے لئے معافی کا خواستگار کیونکر ہوگا جس کا فردِ جرم میں ذکر ہی نہیں ۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں
وہ بات ان کو بہت ناگوار گذری ہے

ریہرسل :-

پچھلے ہفتے کسی کام سے یونیورسٹی جانا پڑا۔ سب سے پہلے شعبہ اُردو کا رُخ کیا۔ اور شعبہ اُردو جناب سروری صاحب کے بارے میں معلوم ہوا کہ دہلی تشریف لے گئے ہیں۔ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کے بارے میں معلوم ہوا کہ آئے اور چلے گئے۔ حامدی صاحب کے متعلق دریافت کیا۔ تو معلوم ہوا کہ چھٹی پر ہیں۔ اسداللہ کاملی صاحب کے بارے میں استفسار کیا تو جواب ملا کہ ان کا آج Off ہے۔ شمس الدین صاحب کہاں ہیں؟ میں نے آخری سوال کیا۔ ''یہیں تھے، معلوم نہیں کہاں گئے؟'' باہر نکلا تو دیکھا ایک درخت کے نیچے ایک طالبہ اور طالب علم ''رومیو جیولٹ'' کی ریہرسل کر رہے تھے!

☆

۷ دسمبر ۱۹۷۸ء

بیس سال قبل......بیس سال بعد

حضرت دستگیر صاحب کے پاس ایک عورت اپنے بچے کو لیکر آئی، اور عرض کیا کہ یہ بچہ کھانڈ کھاتا ہے اس کو (یہ) کھانے سے منع فرمائیے، آپ نے فرمایا کہ کل اسے میرے پاس لے آنا، جب دوسرے دن عورت بچہ کو لے آئی، تو آپ نے بچہ سے فرمایا۔ کہ کھانڈ نہ کھانا، عورت نے کہا کہ یہ بات تو آپ کل بھی اس بچے سے کہہ سکتے تھے، آپ نے جواباً فرمایا کہ کل میں نے خود کھانڈ کھائی تھی، بچے کو نہ کھانے کا حکم کیسے دیتا اور میری نصیحت اس پر کیسے اثر کرتی۔

ساڑھے چار سال، جیل میں رہ کر میں نے اپنے نفس کا جائزہ، لیا۔ اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر مجھ میں خامیاں نہ ہوتیں، اور میں گنہگار نہ ہوتا، تو ان دوستوں کے دلوں میں ہرگز ایسا خیال پیدا نہ ہوتا۔ جس کا ثمر ۹/اگست ۱۹۵۳ کے واقعات ہیں۔ میرے گناہوں کی وجہ سے ہی قوم کو تکلیف اُٹھانا پڑی، اس لئے میں نے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا اور گناہوں کی مغفرت چاہی، اس بارے میں، میں نے قرآن سے کافی سبق حاصل کیا۔

آپ کو اپنے شیشے میں اُتارنے کے لئے ان لوگوں نے نئے نئے کھیل کھیلے، ایکٹرسوں کو لاکر ناچ نچوائے، پہلوانوں کو پیش کیا، جشن کشمیر کے نام سے بچہ نغمے کرائے خلاف شرع اور احکام خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے منافی اقدامات پر لاکھوں روپے برباد کئے"۔

۱۳رجنوری ۱۹۵۸ء کو درگاہ شریف حضرت بل میں شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی طویل تقریر کے اقتباسات)

۹راگست ۱۹۵۳ء کو گرفتار ہونے کے بعد جنوری ۱۹۵۸ء میں اپنی رہائی کے بعد درگاہ شریف حضرت بل میں ایک جم غفیر کے سامنے شیخ صاحب نے جو اہم اور طویل تقریر کی، اوپر نقل کئے ہوئے اقتباسات میں نے اسی تقریر سے لئے ہیں۔ یہ تینوں اقتباسات بیس سال پرانے ہیں۔ اور ان بیس سالوں میں شیخ صاحب، ان کی سیاست اور ان کے نظریات نے اتنی کروٹیں بدلی ہیں۔ کہ اپنے ان ارشادات کے پسِ منظر میں آج انہیں پہچاننا بھی مشکل ہوگیا ہے آیئے، ان تین اقتباسات کی روشنی میں شیخ محمد عبداللہ کے بدلے ہوئے کردار پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں۔ حضرت دستگیر صاحب سے منسوب کہانی کا حوالہ دے کر ۲۰ سال قبل شیخ صاحب عوام الناس پر یہ واضح کردینا چاہتے تھے کہ جب تک ناصح، رہنما رہبر اپنے کہے ہوئے پر خود عمل نہ کرے، اس کی نصیحت کا دوسروں پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ لیکن آج ۲۰ سال بعد ان کی زندگی اور ان کے نظریات میں ایک ایسا انقلاب آگیا ہے کہ ان کی دانست میں ناصح، رہبر، رہنما کا اپنے اقوال پر خود عمل کرنا

نہ صرف غیر ضروری ہے بلکہ غیر مناسب بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ساری دنیا کو قناعت، سادگی، فقیری درویشی اور زاہد وتقویٰ کا درس دینے کے باوجود شیخ صاحب کی اپنی زندگی کا سٹائل بیک وقت مغل بادشاہوں اور انگریز لاٹھ صاحبوں کی نقل ہے انہیں غیر ملکی کاریں، عالیشان ہوٹل، انگریزی لباس، ہیلی کاپٹر اور سرمایہ داروں کی مہمانی بہت مرغوب ہے۔ اور ان کی یا ان کے گھرانے کی کسی فرد کی زندگی پر اس سادگی، قناعت و درویشی کا ہلکا سا پرتو بھی نہیں پڑا ہے۔ کہ جس کا درس دیتے دیتے انہوں نے عوام الناس کو ''بور'' کر دیا ہے اسی طرح سرکاری افسروں، اپنی کابینہ کے وزیروں اور اپنے دوسرے ساتھیوں کو وہ یہ تلقین کرتے ہوئے نہیں تھکتے، کہ انہیں سرکاری خزانے اور سرکاری املاک کو قومی امانت سمجھ کر اس کی حفاظت کرنا چاہیے لیکن وہ خود سرکاری خزانے اور سرکاری جائیداد کو اپنا خاندانی ورثہ سمجھ کر اس بے دردی اور بے رحمی سے استعمال کرتے ہیں۔ کہ ریاست کی ۳۰ سالہ تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی ہے۔ نوجوانوں کو کردار، اخلاق، شریعت اور آداب کا درس دیتے ہوئے شیخ صاحب کبھی اپنے داماد اور اپنے صاحبزادوں کے کردار ان کے اخلاق اور آداب کا جائزہ لینے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ الغرض جو بات اوروں کے لئے پسندیدہ سمجھتے ہیں۔ اسے اپنے لئے ناپسندیدہ اور جو اوروں کے لئے ناموزوں وہ اپنے اور اپنے خاندان کے لئے مناسب اور ضروری سمجھتے ہیں۔

اب آیئے۔ ان کی تقریر کے دوسرے اقتباس کا جائزہ لیں۔ ۲۰ سال قبل

شیخ صاحب نے ایک کمزور لمحے میں اس بات کا اعتراف کر لیا تھا۔ کہ ۹ر اگست ۱۹۵۳ء کو ان کے ساتھ جو کچھ ہوا۔ وہ ان کی اپنی خامیوں، بلکہ گناہوں کا ثمرہ تھا ۔اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے برملا طور پر یہ اعتراف کر لیا تھا کہ

''میرے گناہوں کی وجہ سے ہی قوم کو تکلیف اُٹھانا پڑی''

شیخ صاحب کے اس اعتراف گناہ کی تصدیق بہت سے ان ذرائع نے بھی کی ہے کہ جو ان کے ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۵۳ء تک کے دور اقتدار میں ان کے شریک اور قریب رہے تھے۔ ان ذرائع کا کہنا ہے کہ زمام اقتدار سنبھالتے ہی شیخ صاحب مولوی سے انگریز بن گئے۔ اور انہوں نے کئی بار ان اخلاقی حدود سے تجاوز کیا۔ کہ جو ایک مرد مسلمان کی آن، بان اور شان کے منافی ہیں۔ اس دور سے منسوب بعض کہانیاں اس درجہ نا گفتہ بہ ہیں۔ کہ ان کا تذکرہ بھی ہمیں گوارا نہیں۔ اس کے علاوہ طاقت کے بے جا استعمال، تحکم اور فرعونیت کے وہ درجنوں قصے بھی قومی تاریخ کا ایک حصہ ہیں کہ جو شیخ صاحب کے اقتدار کے اس ابتدائی دور سے وابستہ ہیں۔ اس پس منظر میں شیخ صاحب کا اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے یہ دعویٰ کرنا کہ ۹ر اگست ۱۹۵۳ء کے واقعات ان کے گناہوں کا ثمرہ تھے ان کے انکسار سے زیادہ ان کے اقرار کی علامت تھی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۲۰ سال کے بعد ایک بار پھر زمام اقتدار سنبھالنے کے ساتھ ہی وہ ۱۹۵۸ء کا اپنا اقرار، بھول گئے ہیں۔ اور انہوں نے بڑے شد و مد کے ساتھ پرانی تاریخ دہرانا شروع کر دی ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اب کی بارہ وہ کچھ زیادہ ہی لا

پرواReckless اور رائے عامہ سے قطعی بے نیاز ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اب اپنے آپ کو ہر پابندی سے آزاد، ہر محاسبے سے بے نیاز اور ہر پوچھ گچھ سے لاتعلق سمجھ کر صرف اپنی من مانیاں کرتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اب کی بار شیخ صاحب کے گناہوں کی ناؤ قوم کو کس مصیبت اور کس آزمائش میں مبتلا کر دیتی ہے۔

اب بابائے قوم کی تقریر دل پذیر کے تیسرے اور آخری اقتباس کو لیجئے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں بخشی صاحب مرحوم پر یہ الزام عائد کیا تھا۔ کہ انہوں نے ''نئے نئے کھیل کھیلے، ایکٹرسوں کو لا کر ناچ نچوائے۔ پہلوانوں کو پیش کیا۔ جشن کشمیر کے نام سے بچہ نغمے کروائے۔ خلاف شرع اور احکام خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے منافی اقدامات پر لاکھوں روپے برباد کئے''

جہاں تک نئے نئے کھیل کھیلنے کا سوال ہے یہ کوئی ایسا قابل مواخذہ جرم نہیں، کہ جس کی خاطر بخشی صاحب کو مورد الزام گردانا جاسکتا ہے اسی طرح ایکٹرسوں کا کام ناچنا ہے۔ اور اگر بخشی صاحب نے ناچنے والیوں کو نچوایا۔ تو یہ بھی بظاہر کوئی بہت بڑا گناہ نہیں ہے۔ پہلوانوں سے کشتی لڑوانا غالباً اسلامی شرع کی رو سے ناجائز نہیں۔ اس لئے اس پر بھی بخشی صاحب کے خلاف فرد جرم نہیں لگ سکتی۔ بچہ نغمہ ہماری تاریخ ہمارے تمدن کا ایک حصہ ہے۔ بعض لوگوں کی نگاہوں میں یہ ناپسندیدہ ضرور ہے، لیکن اتنا بھی نہیں، کہ اسے خلاف شرع یا خلاف اسلام قرار دیا جائے۔

اس کے برعکس اب آیئے اس بات کا جائزہ لیں کہ خود شیخ صاحب نے

زمام اقتدار سنبھالنے کے بعد کشمیر کی ثقافت اور تمدن کے نام پر کیا کچھ کیا۔

اقتدار کے پہلے ہی سال انہوں نے کشمیر سے خوبصورت لڑکیوں پر مشتمل ایک گروپ تیار کر کے اسے ہندوستان کے مختلف شہروں میں نمائش کے لئے پیش کیا۔ ان لڑکیوں کو زرق برق رنگین پوشاکیں پہنا کر مردوں کے دوش بدوش سخت ہیجان انگیز رقص اور موسیقی کے پروگراموں میں حصہ لینے پر مجبور کیا گیا۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ بخشی صاحب پر ایکٹرسوں کو نچوانے کا الزام دینے والے قائد اعظم کشمیر کی بہو بیٹیوں کو کشمیر سے باہر لیجانے اور نچوانے کے ہر پروگرام میں بہ نفس نفیس شریک رہے۔ میں نہیں جانتا۔ کہ کالج میں پڑھنے والی کمسن بچیوں اور غریب گھروں کی بہو بیٹیوں کو ہندوستان کی سیر کا لالچ دے کر دلی، حیدر آباد، پٹنہ، کلکتہ اور ہندوستان کے دوسرے شہروں میں اشتعال انگیز سنگھار کر کے پیش کرنا شرع اسلامی، احکام خداوندی اور منشا کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہاں تک مطابقت رکھتا ہے؟ نوجوان، غیر شادی شدہ کمسن اور زیر تعلیم طالبات کو کلچرل ٹروپ کے نام سے غیر محرم مردوں کی نگرانی میں ہر سال ریاست سے باہر ملک کے مختلف شہروں میں اپنی نمائش کے لئے بھیجنا، شیخ صاحب کی حکومت کا ایک باقاعدہ نیچر بن گیا ہے، اور اس پر ہر سال ایک لاکھ سے زائد روپے خرچ کیا جاتا ہے۔ تعجب ہے کہ جو شخص ۲۰ سال قبل ایکٹرسوں کے ناچنے اور پہلوانوں کے دنگل کو خلاف شرع اور خلاف اسلام قرار دے کر کشمیری عوام کو عزت نفس اور خودداری کے سبق پڑھا رہا تھا۔ وہ آج کشمیر کی معصوم، بے

زبان، غریب اور نوجوان لڑکیوں کو رنگین ملبوسات پہنا کر ہزاروں اجنبی مردوں کی بھوکی نگاہوں کا مرکز بنانے پر ہر سال ہزاروں روپے خرچ کرتا ہے اس تہذیبی انقلاب اور تمدنی احیاءِ نو کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ریاست کی کلچرل اکاڈمی کی طرف سے منظّم کئے جانے والے ان کلچرل پروگراموں میں آج تک کسی وزیر، کسی لیڈر یا کسی قائدِ اعظم کی صاحبزادی، پوتی، نواسی یا کسی دور کی رشتہ دار نے بھی حصہ نہیں لیا ہے۔ عام لوگوں کے لئے یہ بات شاید باعث حیرت ہو کہ بخشی صاحب نے اپنے اقتدار کے گیارہ برسوں میں ایکٹرسوں کو ناچ نچوائے، بچہ نغمے کروانے اور پہلوانوں کے ونگل کرانے پر کل جتنا روپیہ خرچ کیا تھا۔ ہمارے شیرِ کشمیر نے صرف تین سالوں کے اندر اندر اس سے کہیں زیادہ رقم کشمیر کی بہو بیٹیوں کو دلی، کلکتہ اور بمبئی میں ناچ نچوانے پر خرچ کر دیا ہے۔ اور اس پر بھی دعویٰ ہے پارسائی کا ر ایمانداری کا اور خدا پرستی کا!

☆

۱۶؍اکتوبر ۱۹۷۷ء

کیا ہم سب بخشی غلام محمد ہیں؟

شیخ صاحب سے چراغ بیگ کا استفسار

محترم شیر کشمیر!

میں نے اب کی بار نائب وزیر اعظم مرزا محمد افضل بیگ سے مخاطب ہونے کا فیصلہ کیا تھا، اور اس مقصد کے لئے قلم ہاتھ میں اُٹھایا ہی تھا۔ کہ خبر آئی کہ صدر جمہوریہ شری نیلم سنجیوا ریڈی کے اعزاز میں آپ کی طرف سے دیئے گئے ڈنر کے موقع پر گرلز کالج کی نوجوان لڑکیوں کے رقص و موسیقی کا پروگرام دیکھ کر افتخار حسین انصاری نام کے ایک مولوی صاحب احتجاجاً محفل سے اُٹھ کر چلے گئے۔ اور بعد میں اخبارات کے نام ایک بیان جاری کیا۔ جس میں بہو بیٹیوں کی عزت و آبرو کا حوالہ دے کر آپ کی مہمان نوازی کے اس رنگین عنصر کو اپنی قومی روایات اور مذہبی مزاج کے منافی قرار دیا۔ اس مرحلے پر میں نے بیگ صاحب کی بجائے براہ راست آپ سے مخاطب ہونے کا فیصلہ کیا۔ اور یہی آج کے اس محبت نامے کی شانِ نزول ہے، صدر جمہوریہ کے اعزاز میں دی گئی دعوت طعام پر نوجوان لڑکیوں کی موجودگی پر مولوی افتخار حسین انصاری کے احتجاج کو بنیاد بنا کر جماعت اسلامی کے

مولوی صاحبان، سید علی شاہ گیلانی اور سیف الدین قاری بھی لنگر لنگوٹے کس کر اپنی بہو بیٹیوں کی عزت و آبرو بچانے کے لئے میدانِ عمل میں کود پڑے ہیں۔ اور توقع ہے کہ آئندہ چند دنوں میں کچھ اور شکست خوردہ مولوی صاحبان بھی اس سرد جنگ میں شریک ہوکر اپنی گرمئ گفتار کا مظاہرہ کریں۔ جہاں تک مولوی افتخار حسین انصاری کا تعلق ہے۔ یہ وہی کم سواد اور بدفطرت مولوی ہے کہ جس نے ۱۹۷۷ء کے پارلیمانی انتخاب میں مادرِ مہربان کے مقابلے میں آنے کی جسارت کی تھی۔ اور جسے اس جرم میں بڑی ذلت اور رسوئی اُٹھانا پڑی۔ اس کے بعد یہ حضرت ریاست میں جنتا پارٹی کے روحِ رواں بن گئے۔ اور پارلیمانی انتخاب میں اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لئے اسمبلی کے انتخابات میں امیدوار بن گئے۔ اس محاذ پر بھی انہیں منہ کی کھانا پڑی، اور ان کا دل بہت سی امنگوں، آرزؤوں اور حسرتوں کا مزار بن گیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کا آپ کی محفل سے اُٹھ کر چلے جانا۔ ان کے زہد و تقویٰ کی بجائے ان کی سیاست گری کا ایک مظاہرہ تھا۔ اس لئے میں اس کو چنداں اہمیت نہیں دیتا۔ اسی طرح جماعت اسلامی کے مولوی صاحبان کا رویہ بھی آپ کے تئیں ہمیشہ معاندانہ رہا ہے اور یہ لوگ بھی آپ کے خلاف زہر افشانی اور بدگمانی پیدا کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اس لئے میری نگاہوں میں اخلاقی اقدار اور بہو بیٹیوں کی عزت آبرو سے ان کی دلچسپی، مذہبی کم اور سیاسی زیادہ ہے۔ جہاں تک ان معاملات میں، میری ذاتی رائے کا تعلق ہے۔ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ کم از

کم عورتوں کے سلسلے میں ، میں خاصا ترقی پسند ، منصف مزاج اور جدید رجحانات کا حامی ہوں۔ میں عورتوں اور خاص طور پر خوب صورت عورتوں کی طرف نگاہ اُٹھانا نہ گناہ سمجھتا ہوں اور نہ معیوب اور نہ ہی کسی محفل یا بزم میں عورتوں کی موجودگی یا شرکت کو اپنی روایات اور اپنے قومی مزاج کے منافی سمجھتا ہوں۔ میں عورتوں کو صرف چراغ خانہ بنا کر انہیں گھر کی چار دیواری میں قید کرنے کے بھی خلاف ہوں۔ اور نہ میں اتنا کمزور ہوں کہ کسی محفل میں خوبصورت اور نوجوان لڑکی کو دیکھ کر میرا ایمان ڈگمگانے لگے۔ میں عورت کو فرنیچر، قالین اور ٹیلی ویژن کی طرح جائیداد نہیں سمجھتا۔ اس کی شخصیت اور اس کے انفرادی وجود کا قائل ہوں۔ اور میری دانست میں عورت کو گناہ یا گناہ کی ترغیب سمجھنا غیر اسلامی، غیر اخلاقی اور غیر فطری ہے، اس لئے میں کم از کم اس معاملے میں انصاریوں ، گیلانیوں ، اور قاریوں کے مقابلے میں آپ سے زیادہ قریب اور ہم آہنگ ہوں!

قبلۂ محترم!

میں افتخار حسین انصاری ، سید علی گیلانی اور سیف الدین قاری کے الزامات کو نظر انداز کرتا ہوں۔ اور میں نے اس سلسلے میں اپنے خیالات اور نظریات بھی واضح کر دئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود، عوامی حلقوں میں اور خود میرے ذہن میں اس مسئلے کے متعلق آپ کے رویے کی نسبت کچھ سولات پیدا ہوئے ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے نکتہ چینوں کے ساتھ ساتھ اپنے عقیدت مندوں کی تسلی و تشفی کے لئے بھی ان کا کوئی معقول

جواب دیں۔

یہ صحیح ہے کہ آپ ہمارے روایتی اور پیشہ ور مولویوں کی طرح زاہد خشک یا تنگ نظر نہیں ہیں۔ اور بالخصوص عورتوں کے معاملے میں آپ کے خیالات اور نظریات خاصے ترقی پسندانہ ہیں۔ لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پر قائم ہے۔ کہ آپ محض سیاستدان ہی نہیں، ایک سچے مسلمان بھی ہیں اور اگر میرا تجزیہ غلط نہیں ہے، تو میں کہنے کی جسارت کروں گا۔ کہ سیاست میں آپ کی غیر معمولی کامیابی کا آپ کے مسلمان ہونے کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ کشمیری عوام کی آپ سے گہری عقیدت، آپ کے سیاسی کردار سے زیادہ آپ کے مذہبی مزاج اور آپ کے اخلاقی مرتبے سے ہے اور میں نے بارہا شہر اور بالخصوص دیہات کے بہت سے مرد و زن کو آپ سے تعویذ مانگتے یا بیماروں پر اپنی دستِ شفقت پھیرنے کا مطالبہ کرتے دیکھا ہے، آپ کی بھی ہمیشہ یہی کوشش رہتی ہے، کہ آپ اپنی مذہبیت اور اسلام سے اپنی والہانہ وابستگی کا بھر پور مظاہرہ کریں۔ اور اسی لئے آپ بالعموم اپنی تقریروں کا آغاز تلاوتِ کلام پاک سے کرتے ہیں۔ آج سے تیرہ سال قبل آپ نے راولپنڈی (پاکستان) میں دس لاکھ کے مجمع عام میں سٹیج پر نماز ادا کر کے پاکستانی مولویوں اور مذہبی رہنماؤں پر بھی اپنے سچے مسلمان ہونے کا سکہ جما لیا تھا۔ الغرض، آپ نے اپنی شخصیت میں سیاست اور مذہب کو کچھ اس طرح سمو دیا ہے۔ کہ آپ کے بہت سے عقیدت مند آپ کو سیاسی لیڈر سے زیادہ اپنا مذہبی رہنما سمجھتے ہیں۔ اور یہی آپ کی شخصیت کے طلسم کا راز بھی ہے۔

بابائے قوم!

اپنی شخصیت اور شبیہہ کے اس پس منظر میں، ہمیں یہ بتانے اور سمجھانے کی کوشش کیجئے۔ کہ زنانہ کالجوں سے خوبصورت، نوجوان اور بھولی بھالی لڑکیوں کو انتہائی دیدہ زیب، شوخ اور رنگین لباس پہنا کر معزز مہمانوں کے سامنے ان کی پریڈ کرانا کیا خالص اسلامی اور اخلاقی نکتہ نظر سے جائز ہے؛ مجھے اس محفل رقص وسرور میں شرکت کی سعادت حاصل نہیں تھی کہ جہاں سے مولوی افتخار حسین انصاری احتجاجاً اُٹھ کر چلے آئے۔ لیکن عین شاہدین نے مجھے بتایا کہ گرلز کالج سرینگر کی نوجوان طالبات کے ایک حسین جھرمٹ نے انتہائی بھڑ کیلئے ملبوسات اور زیورات پہن کر صدر جمہوریہ اور دوسرے معزز اور غیر معزز مہمانوں کے سامنے ایک ایسا دلفریب رقص پیش کیا، کہ دیکھنے والے دنگ رہ گئے، مجھے بتایا گیا۔ کہ ایک تیرہ چودہ سالہ بچی نے بے حد شوخ اور اشتعال انگیز لباس پہن کر وہ رقص پیش کیا کہ جسے ہمارے دور غلامی میں حافظائیں (اس دور کی طوائفیں) پیش کیا کرتی تھیں۔

اور اس کے ساتھ چمکتے ہوئے کشمیری پیرہنوں میں سجی ہوئی کالج کی طالبات نے چھکری پیش کی۔ معلوم ہوا ہے کہ اس تقریب میں شرکت کے لئے ہماری ان بیٹیوں اور بہنوں کو انتہائی شوخ میک اَپ سے سنوارا گیا تھا۔ اور دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ حسین وجمیل اور......شوخ وشنگ طالبات کی موجودگی سے اس رات آپ کی قیام گاہ بڑا ہی توبہ شکن اور قیامت خیز منظر پیش کررہی تھی۔ میں اس موقع پر پھر اپنے اس موقف کا اظہار کرنا ضروری

سمجھتا ہوں کہ میں رقص و سرور کی ان محفلوں میں حسین و جمیل لڑکیوں کی اس نمائش کے خلاف نہیں ہوں۔ لیکن میری بات رہنے دیجئے کہ میں نہ کوئی سیاسی لیڈر ہوں اور نہ مجھے مذہبی رہنما ہونے کا دعویٰ ہے۔ آپ یہ بتائیے کہ آپ حسن و جمال اور رقص و موسیقی کے ان مظاہروں کو اپنی مذہبیت اور اپنے سچے مسلمان ہونے سے کس طرح ہم آہنگ کریں گے؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ آپ کے معزز مہمان، خوبصورت اور نوجوان لڑکیوں کی دل کشی اور جوانی سے مسحور ہو کر اس طرح بے خود ہو جاتے ہیں کہ انہیں کھانے کی دھن ہی نہیں رہتی؟ کیا آپ نے گرلز کالج کی نوجوان طالبات کے رقص کرتے وقت کبھی اپنے مہمانوں کی آنکھوں میں جھانک کر یہ دیکھنے کی زحمت گوارا کی ہے۔ کہ کس طرح ہماری بہنوں اور بیٹیوں کے جسم ان کے ذہنی تعیش کا سامان بن رہے ہیں، کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اس تعیش، جنسی، جذباتی اور نفسیاتی کیفیت میں زیادہ شدت پیدا کرنے کی غرض سے ہی ایسے مواقع پر نوجوان لڑکیوں کو بھڑکیلے لباس اور میک اَپ سے سنوارا جاتا ہے۔ اپنے مہمانوں کا دل لبھانے، ان کی ذہنی عیاشی اور ان کی جذباتی تسکین کے لئے گرلز کالج کی معصوم طالبات کا استعمال خودداری عزت و آبرو اور غیرت مندی کی کون سی کتاب کی رُو سے جائز ہے؟۔

میرے وزیراعظم!

ابھی دو ہفتے قبل سرینگر کے اس زنانہ کالج میں کہ جہاں کی طالبات نے صدر جمہوریہ کو دئے گئے عشائیے میں اپنے رقص اور موسیقی کا مظاہرہ

کیا۔ فن فیر کے نام سے ایک میلے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس میلے کا مقصد ایک انتہائی نیک اور مقدس کاز کے لئے پیسے جمع کرنا تھا۔ اور میں ذاتی طور پر نیک کاموں کے لئے اس قسم کے پروگراموں کے خلاف نہیں ہوں۔ لیکن میری بات رہنے دیجئے کہ مجھے بہر حال اپنے اعمال کی سزا کے طور پر جہنم کی آگ میں جلنا ہوگا آپ یہ بتائیے۔ کہ گرلز کالج کے اہتمام سے کالج کے احاطے میں اس میلے کے منعقد کرنے کا مقصد کیا یہ نہیں تھا۔ کہ نوجوان طالبات کو دیکھنے ان سے راہ و رسم بڑھانے اور اپنی جذباتی تسکین کے لئے شہر کے ہزاروں نوجوان (بوڑھے بھی) کالج پر ٹوٹ پڑیں گے۔ اور اس طرح کالج کی لڑکیاں اپنے اپنے سٹالوں پر اپنی نوجوانی اور خوبصورتی کے بل بوتے پر ایک عظیم مقصد کے لئے زیادہ سے زیادہ پیسے جمع کر سکیں گی؟ جن لوگوں نے گرلز کالج میں اس میلے کا اہتمام کیا تھا۔ ان کا اندازہ بالکل صحیح ثابت ہوا۔ اور میں نے اپنی آنکھوں سے ہزاروں نوجوانوں کو گرلز کالج پر اس طرح ٹوٹتے ہوئے دیکھا کہ جیسے شہد پر مکھیاں ٹوٹتی ہیں۔ دوسرے دن کئی مقامی اخبارات میں فن فیر کے دوران طلبا اور طالبات کے باہمی اختلاط اور اخلاص کے مظاہروں کی جو اصل اور فرضی کہانیاں شائع ہوئیں، میں ان کو اہمیت نہیں دیتا۔ کیونکہ تنگ نظر اور قدامت پسند لوگوں کی نگاہوں میں لڑکیوں اور لڑکوں کا ایک دوسرے سے ملنا اور بات کرنا بھی گناہ ہے۔ لیکن اے میرے رہبر! مجھے یہ بتا کہ کیا گرلز کالج میں اس میلے کا اہتمام صرف اس نیت سے نہیں کیا گیا تھا۔ کہ زیادہ سے زیادہ مرد آ کر یہاں زیادہ سے زیادہ پیسے صرف

کریں گے؟ کیا اس طرح ہم نے اپنی بہو بیٹیوں کو اپنے حسن اور نکھار کا مظاہرہ کر کے نوجوان کی جیبیں خالی کرنے اور انہیں ذہنی عیاشی کرنے کے مواقع فراہم نہیں کیئے؟ اگر یہ بات نہیں ہے، تو اس میلے کا اہتمام گرلز کالج ہی میں کیوں کیا گیا۔ ایس، پی، کالج، امر سنگھ کالج، یا انجینئرنگ کالج میں کیوں نہیں کیا گیا؟ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ آپ اور بیگم صاحبہ اس میلے میں بھی تشریف لے گئے، اور آپ نے اپنی آنکھوں سے ہزاروں نوجوانوں کو ایک مقدس کاز کے لئے اپنے ماں باپ کی کمائی لٹاتے دیکھا۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس قسم کی تقریبات اور تفریحات سے کیا آپ کی وابستگی ہماری غیرت اور ہمارے جذبۂ خودداری کو کند کر کے ہمیں خود اپنی نگاہوں میں گرانے کے لئے کافی نہیں ہے؟

شیرِ بھارت!

چار سال قبل، جب اُس دور کی زنانہ کالج کی پرنسپل نے اپنے کالج میں مدعو مہمانوں کے سامنے اسی نوعیت کی ایک محفل کا اہتمام کیا تھا تو میں نے گرلز کالج کو تفریحی کلب بنانے کے رجحان کے خلاف اسی اخبار میں ایک بڑا ہی سخت مقالہ سپرد قلم کیا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب آپ میری جرأت اور میرے قلم کی طاقت پر بُری طرح عاشق تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آپ نے میرے اس زوردار احتجاجی مقالے کی بڑی تعریف کی تھی۔ اور اگر میرا حافظہ مجھے دھوکا نہیں دیتا تو آپ نے میرے خیالات سے مکمل اتفاق کیا تھا۔ یہ چار سال پرانی بات ہے اور مس محمودہ احمد علی کا جرم صرف یہ

تھا کہ اس نے اپنے کالج میں ایک محفلِ نشاط کا اہتمام کیا تھا۔ ان چار سالوں کے دوران دُنیا کتنی بدل گئی ہے اس وقت آپ مہمان تھے، آج آپ میزبان ہیں۔ اس وقت مجھے شکایت مس محمودہ سے تھی۔ آج شکایت آپ سے ہے محمودہ جی کا جرم کالج کی چاردیواری تک محدود تھا۔ لیکن آپ کے اس گناہ کا کیا عنوان مقرر کروں کہ آپ نے گرلز کالج کی طالبات کو کالج سے اپنی سرکاری قیام گاہ تک پہنچا دیا ہے اس وقت میرے زور قلم کی داد آپ نے دی تھی، یہ بتائیے، کہ آج میری شعلہ بیانی کی داد کون دے گا؟

میں نے یہ سوال پہلے بھی پوچھا ہے اور آج پھر پوچھنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ ہماری تمام تہذیبی اور تمدنی سرگرمیاں صرف امیرا کدل اور نوا کدل کے زنانہ کالجوں تک ہی کیوں محدود ہیں؟ ہر ہفتے ان ہی کالجوں میں کوئی نہ کوئی ڈرامہ، مشاعرہ، مناظرہ یا اسی نوعیت کا کوئی دوسرا پروگرام کیوں ہوتا ہے؟ اور آپ کا ہر پروگرام میں شرکت کرنا کیوں ضروری سمجھا جاتا ہے؟ کیا ہمارے مردانہ کالجوں میں اس قسم کی کوئی سرگرمی نہیں ہوتی اور اگر نہیں ہوتی تو اس کا سبب کیا ہے؟ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میری طالب علمی کے زمانے میں ایس، پی کالج اور امر سنگھ کالج اس قسم کی تہذیبی، تمدنی اور ادبی سرگرمیوں کے مرکز ہوا کرتے تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب ان تمام سرگرمیوں کی اجارہ داری زنانہ کالجوں کو حاصل ہوگئی ہے۔ اور ہمارے شہر میں امیروں، وزیروں اور سرکاری افسروں کو ذہنی تفریح کے لئے ان کالجوں کے علاوہ کوئی دوسرا ادارہ ہے ہی نہیں۔ میں یہ بات پھر دہرانا چاہوں گا کہ

مجھے بھی مردانہ کالجوں کے مقابلے میں زنانہ کالجوں سے ہی زیادہ دلچسپی ہے۔
لیکن میری بات رہنے دیجئے؟ کہ میں بڑا گنہگار اور خطا کار ہوں اور میں جانتا ہوں کہ مجھے اپنے گناہوں کی بھرپور سزا ملنے والی ہے آپ بتائیے، کہ آپ جو ایک سیاسی رہنما ہی نہیں ایک مذہبی رہنما اور اس ریاست کے وزیر اعظم بھی ہیں۔ آپ زنانہ اور مردانہ کالجوں میں یہ امتیاز کیوں کرتے ہیں؟ ہر معزز مہمان کو گرلز کالج میں ہی تمدنی پروگرام دیکھنے کی دعوت کیوں دی جاتی ہے؟ اور اب گرلز کالج کی ہی طالبات کو سرکاری تقریبات میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لئے کیوں بلوایا جاتا ہے؟

قائداعظم!

اپنے حافظے پر زور دے کر یاد کیجئے، کہ کیا مرحوم بخشی غلام محمد کے خلاف آپ نے بارہا یہ الزام عائد نہیں کیا، کہ اس نے رقص و سرور اور عیش و عشرت کی محفلیں سجا کر کشمیری عوام کی غیرت اور ان کے جذبۂ خودداری کو مجروح کیا؟ کیا آپ نے مرحوم کے ''جشن کشمیر'' کا مذاق اُڑا کر اس پر ''بچہ نغمہ'' جیسی مکروہ روایت کو زندہ کرنے کا الزام عائد نہیں کیا؟ کیا آپ اپنی تقریر میں کشمیر کی تاریخ کے اس دور کا ذکر نہیں کرتے، کہ جب غیر ملکی حکمران، ہماری بچیوں کو سامان عیش سمجھ کر انہیں اپنی محفلوں کی رونق بڑھانے اور سجانے کے لئے استعمال کیا کرتے تھے؟ مجھے ذاتی طور پر اس بات کا علم اور احساس ہے کہ آپ اپنی قوم کو خودی اور خودداری کی اس معراج تک لے جانا چاہتے ہیں کہ جہاں شاعر مشرق کے الفاظ ہیں۔

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

لیکن میرے محترم! گرلز کالج کی طالبات کو معزز مہمانوں کے سامنے رقص کروانے سے نہ بخشی غلام محمد کی روایات ختم ہوں گی اور نہ ہم میں قومی غیرت اور خودداری کا جذبہ پیدا ہوسکتا ہے کیا آپ غیر شعوری طور پر بخشی صاحب کی قائم کی ہوئی روایات کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ کیا بنیادی طور پر ہم سب بخشی غلام محمد ہیں؟ مگر نہیں۔ اس مرحوم کے حق میں ایک بات کہنے کی اجازت دیجئے۔ اس نے کبھی کسی مہمان کے سامنے نوجوان لڑکیوں کا رقص پیش نہیں کیا۔ وہ زیادہ سے زیادہ بچہ نغمہ سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ہم تو ان سے ایک قدم آگے بڑھ گئے ہیں۔ اور مناسب یہ ہے کہ اس مرحلے پر ہم لمحے بھر کے لئے رُک جائیں اور اس بات کا جائزہ لیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔

محترم شیخ صاحب! میں اس خط کو ختم کرنے سے پہلے ایک بار پھر یہ بات دہرانا چاہوں گا کہ میں عورتوں اور مردوں کے اختلاط کے خلاف نہیں ہوں۔ میں اپنے گرلز کالجوں کو ہر مرد کے لئے Out of Bond قرار دینے کے بھی خلاف ہوں۔

میں جائز حدود کے اندر نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے میل ملاپ کے حق میں ہوں۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ میں عورتوں کو چراغ خانہ بنا کر ان کی آزادی، انفرادیت اور شخصیت کو پامال کرنے کو گناہ سمجھتا ہوں۔ لیکن میں گرلز کالجوں میں زیر تعلیم غیر شادی شدہ لڑکیوں کو مردوں اور مہمانوں کا دل بہلانے کے لئے استعمال کرنے کے رجحان کے خلاف

ہوں ۔ میں لڑکیوں کو تنگ اور چست لباس پہنا کر فن فیر کے نام پر مردوں سے پیسے بٹورنے کے جذبے کی مذمت کرتا ہوں ۔ اور میرا خیال ہے کہ آپ بالکل غیر شعوری طور پر اس قسم کی رجحانات کی حوصلہ افزائی کا باعث بن رہے ہیں ۔ دنیا بھر میں اور ملک کے دوسرے حصوں میں کیا ہوتا ہے ہمیں اس سے غرض نہیں ۔ ہماری کچھ روایات ہیں ۔ ہماری سماجی زندگی کے کچھ آداب ہیں ۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ ہمارے مسلم رہنما اور قائد ہیں ۔ آپ جو کچھ کریں گے، آپ سے کم تر درجے کے لوگ اسے مثال مان کر ہمارے معاشرے میں بہت سی خرابیاں پیدا کر سکتے ہیں...... مجھے آپ کی نیت، آپ سے خلوص اور آپ کے کردار کی پاکیزگی پر پورا وشواس ہے ۔ لیکن نیتوں کا اظہار عمل سے اور خلوص کا اظہار اطوار سے ہونا چاہیے اور مجھے اُمید ہے کہ آپ اس سلسلے میں میری معروضات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے ۔

فقط

آپ کا مخلص

چراغ بیگ

☆

۲۹ نومبر ۱۹۷۷ء

راز دان بی اے کے خطوط
دو آزادوں کے نام

سردار ہر بنس سنگھ آزاد کے نام:-

محترم سردار صاحب!

مقامی اخبارات میں یہ خبر پڑھے کئی دن گذر گئے کہ آپ نے نیشنل کانفرنس کے صدرِ محترم جناب شیخ محمد عبداللہ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر نیشنل کانفرنس کا لائف ممبر بننے کی درخواست کی تھی۔ ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ آپ کی یہ درخواست منظور ہوئی ہے یا نہیں۔ اور نہ ہی اخبار والوں نے یہ بتانے کی زحمت کی ہے۔ کہ آپ کی اس بے مثال پیشکش پر جناب شیخ صاحب نے کیا ردِ عمل ظاہر کیا۔ قیاس غالب ہے۔ کہ انہوں نے آپ کے حُلیے پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر دل ہی دل میں اس بات پر افسوس کیا ہوگا۔ کہ جس قوم کا کردار بلند کرنے کے لئے انہوں نے ۴۶ سال تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، اس قوم کا کردار ابھی کتنا پست اور اس کے پڑھے لکھے افراد کی ذہنیت کس درجہ موقع پرستانہ ہے۔ نیشنل کانفرنس کا لائف ممبر بننے کا خیال یقیناً ایک نادرِ خیال ہے۔ اور میں آپ کی اس جدتِ طبع کے لئے آپ کو داد دئے بغیر نہیں رہ سکتا، لیکن اپنے اس خیال

کوالفاظ کالباس پہناتے وقت آپ شاید بھول گئے کہ ۱۹۵۱ء میں قانون ساز اسمبلی کا ممبر بننے سے پہلے آپ غالباً تاریخ کے پروفیسر تھے اور تاریخ کے پروفیسر کو یہ بات معلوم ہونا چاہیے۔ کہ سیاسی جماعتوں کی لائف ممبرشپ ایک بے ہودہ تصور اور ایک فرسودہ روایت ہے۔ بے ہودہ اس لئے کہ سیاست ایک ارتقاء پذیر سائنس کا نام ہے۔ اور جس طرح نئی دریافتوں کے بعد سائنسی حقائق اور معروضات بدلتے رہتے ہیں۔ اسی طرح سیاسی جماعتیں اور سیاسی تصورات بھی وقت کے تقاضوں اور تاریخی اصولوں کی روشنی میں بدلتے رہتے ہیں۔ کوئی شخص زندگی بھر ایک تصور، ایک جماعت یا ایک لیڈر کا وفادار رہنے کی قسم اس لئے نہیں کھا سکتا کہ تصورات بدلتے رہتے ہیں۔ جماعتیں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ اور لیڈر بھی وقتی مصلحتوں کے زیر اثر بدلتے رہتے ہیں۔ ایک پڑھے لکھے اور خاص کر تاریخ کے پروفیسر کا زندگی بھر ایک جماعت اور ایک لیڈر کا وفادار رہنے کی قسم کھانا اس کی ذہانت سے زیادہ اس کی جہالت کا آئینہ دار ہے۔ میں نے اس روایت کو فرسودہ اس لئے کہا ہے کہ چالیس پچاس برس قبل سیاسی جماعتوں اور لیڈروں سے اس قسم کی جذباتی وابستگی قابل فہم تھی۔ اور اپنے عقیدت مندوں کے اس والہانہ پن سے ہمارے لیڈروں نے بڑے فائدے اُٹھائے، لیکن اب تو چاروں طرف علم کی روشنی ہے۔ اخبارات کی بہتات ہے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا زمانہ ہے اور ہر شخص اپنے طور پر سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اس دور میں بھی اگر آپ جیسے عالم فاضل اپنی باقی ماندہ زندگی کو ایک جماعت یا ایک فرد کے

پاس گروی رکھیں۔ تو مجھے یہ کہنا پڑے گا کہ شاعر مشرق اقبالؔ نے آپ ہی کے بارے میں کہا تھا۔

یہ بتان عصر حاضر کہ بنے ہیں مدرسوں میں
نہ ادائے کافرانہ نہ تراش آذرانہ

محترم آزاد صاحب ! اس اصولی بحث کے بعد میں آپ سے کچھ وکیلانہ اور صحافیانہ استفسارات کرنا چاہوں گا...... یہ بتایئے کہ نیشنل کانفرنس اور شیر کشمیر کی ذاتِ اقدس سے آپ کی یہ بے پناہ عقیدت کیوں اور کب اُس نکتہ عروج تک پہنچ گئی۔ کہ جہاں آپ کو نیشنل کانفرنس کا لائف ممبر بنے بغیر اپنے جذباتی سکون کا کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آیا؟ آپ کو شاید یاد ہو کہ ۱۹۵۱ء میں آپ کو ایس، پی، کالج میں تاریخ کی پروفیسری کے عہدے سے اُٹھا کر آئین ساز اسمبلی کا ممبر بنانے کا فیصلہ شیر کشمیر ہی نے کیا تھا۔ اگر یہ صحیح ہے تو یہ بتایئے کہ ۱۹۵۳ء شیخ صاحب کی برطرفی اور گرفتاری کے بعد آپ نے اپنے محبوب قائد کے خلاف بخشی صاحب، صادق صاحب، ڈی، پی صاحب اور قاسم صاحب کی بہتان تراشی کا دفاع کرنے کے لئے کیا کچھ کیا؟ ۱۹۵۳ء کے بعد آپ بخشی صاحب کے دور میں وزیر بھی رہے، سپیکر بھی رہے اور کئی سال سے کھادی اینڈ ولیج بورڈ کے چیرمین بھی۔ اس ساری مدت کے دوران آپ کو شیخ صاحب کی بے پناہ محبت اور نیشنل کانفرنس کے اعلیٰ اصولوں کی یاد کیوں نہیں آئی؟ اچھا، ماضی کا یہ قصہ رہنے دیجئے۔ کیونکہ اس حمام میں اور بھی بہت سے لوگ ننگے ہیں۔ لیکن یہ بتایئے کہ ریاست میں

نیشنل کانفرنس کے احیاء نو کو اب تین سال ہونے کو آئے ہیں۔ ان تین سالوں میں آپ نے اپنی باقی ماندہ زندگی نیشنل کانفرنس کے لئے کیوں وقف نہیں کی؟ آپ ۱۹۷۵ء اور ۱۹۷۶ء میں اپنے دل کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی محبت اور عقیدت کو ظاہر نہیں کر سکتے تھے؟ مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں نیشنل کانفرنس اور شیخ صاحب دونوں ہی کو ایک زبردست آزمائش اور ابتلا کا سامنا تھا۔ اُس وقت آپ کی محبت اور عقیدت کہاں آوارہ پھر رہی تھی؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ اس وقت آپ کو اور بہت سے لوگوں کی طرح یہ وہم تھا کہ اسمبلی کے انتخابات میں نیشنل کانفرنس اس بری طرح ہار جائے گی کہ شیخ صاحب کو کہیں سر چھپانے کی جگہ بھی نہیں ملے گی۔ اور اسی لئے آپ نے نیشنل کانفرنس کا تاحیات ممبر بننے کی خواہش کو چھپائے رکھا؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ حالیہ انتخابات میں شیخ صاحب کی سرخروئی اور نیشنل کانفرنس کی کامیابی نے آپ کو تاحیات موقع پرستی کا یہ نادر موقع عطا کیا؟

سردار صاحب! میں نہیں جانتا، کہ آپ کی تاریخ پیدائش کیا ہے اور اس وقت آپ کی عمر کیا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ آپ ساٹھ اور پینسٹھ کے درمیان ہوں گے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس عمر کو پہنچ کر آپ جیسے شریف، ایماندار اور بے ریا آدمی کو موقع پرستی، خوشامد ار چاپلوسی کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ بہت دنوں تک وزیر اور اسپیکر بنے رہنے کے بعد بھی کیا آپ کی ہوس اقتدار نہیں بجھی ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ باقی ماندہ زندگی غلام محمد شاہ اور محی الدین شاہ کے قدموں میں گذارنے کی بجائے کوئی کتاب یا

تاریخ لکھنے میں صرف کریں؟ کیا وجہ ہے کہ ہر شخص اقتدار کے کندھوں پر ہی اپنا جنازہ اٹھوانے کے لئے بے تاب اور بے قرار ہے؟ میں نہیں جانتا کہ شیخ صاحب نیشنل کانفرنس کے لئے آپ کی لائف ممبر شپ قبول کریں گے یا نہیں لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس کے بعد بھی آپ کے وزیر بننے کا کوئی چانس نہیں ہے۔ فی الحال یہ چانس ڈاکٹر ہربجھن سنگھ مار گئے ہیں اور اس کے بعد میونسپلٹی کے دھرم سنگھ اُوبرائے کی باری ہے۔ اب آپ ہی سوچئے کہ آپ کی بے کار زندگی شیخ صاحب اور نیشنل کانفرنس کے کس کام آئے گی۔ اِسی کو کہتے ہیں گناہِ بے لذت!

آپ کا مخلص راز دان، بی، اے

جگن ناتھ آزاد کے نام:-

محترم آزاد صاحب!

یہ جان کر بڑی مسرت ہوئی کہ آپ پاکستان میں منعقد ہونے والے عالمی اقبال کانگریس میں شرکت کے لئے پاکستان جارہے ہیں۔ اقبال کے فن اور فلسفے ان کی شخصیت اور زندگی کے متعلق آپ کے تحقیقی اور تاریخی کام کی اہمیت کے پیش نظر پاکستان کی عالمی کانگریس میں ہندوستان کی نمائندگی کے لئے آپ یقیناً سب سے موزوں شخصیت ہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ جس طرح آپ نے ملک بھر میں اقبال شناسی اور اقبال نوازی کی دھاک بٹھادی ہے، اسی طرح آپ پاک ہند میں بھی اپنے علم وفضل اور اپنی بصیرت کا لوہا منوا کر وطن لوٹیں گے۔ لیکن اقبال ہی کے الفاظ میں۔

خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

ابھی پچھلے دنوں اقبال کے متعلق آپ کی تازہ ترین تصنیف ''اقبال اور کشمیر'' کو ایک نظر دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اور مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ حسب معمول اور حسبِ توقع آپ نے اس موضوع پر بھی اپنی وسعت نظر اور علمی بصیرت سے اقبال کی شاعری کے بہت سے تاریک گوشوں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ لیکن معاف کیجئے۔ کہ ایک مقام پر آپ نے اپنے عالمانہ منصب، اپنے تحقیقی مرتبے اور ایک ادبی نقاد کی حیثیت سے اپنے فرائض کو نظر انداز کر کے بہت ہی عامیانہ قسم کی چاپلوسی سے کام کیا ہے۔ میرا روئے سخن، آپ کی کتاب کے اس حصے سے ہے کہ جس میں آپ نے ''جاوید نامہ'' میں غنی اور اقبال کے درمیان مکالمے کے چند اشعار سے یہ معنی اخذ کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال کا روئے سخن مولانا ہمدانی اور جناب شیخ محمد عبداللہ کی طرف ہے۔ آپ کا دعویٰ ہے کہ

آں جواں کو شہرد دشت و در گرفت
ہر درش از شیرِ صد بادر گرفت

میں جن دو جوانوں کی طرف اشارہ ہے وہ مولانا ہمدانی اور شیخ محمد عبداللہ ہیں۔

پروفیسر صاحب! میں اس وقت آپ سے یہ بحث نہیں کروں گا۔ کہ آپ کی تشریح صحیح ہے یا غلط، میں اس بات پر بھی نہیں الجھوں گا کہ آپ نے ۱۹۳۱ء کی لکھی ہوئی نظم میں وہ معانی اور وہ علامتیں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہ جن کا اقبال کے ذہن میں کوئی تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ بحث میں

کسی اور وقت کے لئے ملتوی کرتا ہوں۔ لیکن یہ پوچھنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ یہ نظم جو ۱۹۳۱ء میں لکھی گئی ہے۔ آپ کی نظر سے کب گذری؟ آپ کی اقبال شناسی اور علمی بصیرت کے پیش نظر یہ اندازہ کرنا صحیح ہوگا کہ یہ نظم لگ بھگ ۱۹۳۴ء یا ۱۹۳۵ء میں ہی آپ کی نظر سے گذری ہوگی...... اب یہ بتائیے کہ اقبال کے ان اشعار کے یہ معنی ظاہر کرنے میں آپ نے چالیس سال سے زیادہ کا عرصہ کیوں لگایا؟ آپ نے یہ معانی ۱۹۵۴ء میں کیوں ظاہر نہیں کئے۔ کہ جب شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ کُڈ اور بوٹ کے جیل خانوں میں اقبال کے خواب بھی نظر بند تھے آپ نے کلام اقبال کے دامن میں چھپے ہوئے ان موتیوں کو اس وقت منظرِ عام پر کیوں نہیں لایا۔ کہ جب شیخ عبداللہ پر پاکستان کے ساتھ سازش کے الزام میں مقدمہ چلایا جارہا تھا؟ آپ نے کشمیری عوام کو اقبال کی نگاہوں میں اپنے قائد کی قدر و منزلت کا احساس اس وقت کیوں نہیں دیا کہ جب وہ اس کی نظر بندی اور جلاوطنی کے خلاف ایک خاموش احتجاج کی علامت بنے ہوئے تھے۔ آپ نے جاوید نامہ کے ان اشعار میں پوشیدہ معانی کو ہمارے سامنے پیش کر کے ہمیں یہ ہمت اور حوصلہ کیوں نہیں دیا کہ ہم اقبالؔ کے خوابوں کے وارث اور ان کی تمناؤں کے مظہر ہیں؟ کیا یہ راز افشا کرنے کے لئے پہلے شیخ محمد عبداللہ کا مسز گاندھی کے ساتھ اکارڈ کر کے وزیراعلیٰ ہونا ضروری تھا؟ کیا کلام اقبالؔ میں پوشیدہ اس رمز کا شیخ محمد عبداللہ کے صاحب اقتدار ہونے سے کوئی براہ راست تعلق تھا؟ کیا کسی شخص کے صاحب اقتدار ہونے یا اقتدار سے محروم

ہونے سے اقبالؔ جیسے شاعروں کے کلام کے معنی بھی بدل جاتے ہیں؟ مجھے یہ بتائیے آزاد صاحب! کہ آپ نے اس راز کو اتنی دیر تک اپنے سینے میں کیسے چھپائے رکھا؟ اوران چالیس برسوں میں آپ کا کلیجہ کیوں نہیں پھٹا۔

محترم آزاد صاحب!

ہوسکتا ہے کہ آپ یہ کہیں کہ میں اس دوران سرکاری ملازم تھا۔ اور سرکاری ملازم ناپسندیدہ سیاسی حقائق واشگاف نہیں کرسکتا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کا یہ عذر قابل قبول نہیں، کیونکہ اقبالؔ کے کلام میں شیخ صاحب کے ذکر سے ملک کی سیاسی صورت حال پر کوئی اثر نہیں پڑھ سکتا تھا۔ اورایک محقق کی حیثیت سے اس اظہار کی بناء پر آپ کی تنخواہ اور معیاد ملازمت پر کوئی اثر پڑنے کا اندیشہ نہیں تھا۔ لیکن اگر آپ بضد ہیں کہ مخصوص سیاسی حالات کی بناء پر اس قسم کا امکان تھا تو اس بات کی کیا ضمانت ہے۔ کہ اب جاوید نامے کے اشعار میں آپ کو جو معانی نظر آنے لگے ہیں۔ وہ دراصل اس عنایت خاص کا نتیجہ ہے کہ جس نے آپ کو جموں یونیورسٹی کے شعبہ اُردو کی صدارت بخشی ہے، میری گذارش صرف یہ ہے کہ اقبالؔ کو شاعر رہنے دیجئے۔ اس کو اپنی تجارت، ملازمت اور مصالحت کا ذریعہ نہ بنائیے، اقبالؔ کا سارا فلسفہ اوران کی شاعری جذبۂ خودداری اور خودی کی تفسیر ہے۔ اسے چاپلوسی اور ابن الوقتی کا ذریعہ بنا کر اس کی روح کو تکلیف اور اس کے کلام کی توہین نہ کیجئے۔

فقط آپ کا مخلص داز دان، بی، اے

☆

۱۸ نومبر ۱۹۷۸ء

راز دان، بی، اے کے قلم سے

شیخ صاحب کا گفتار کردار کی روشنی میں

شیخ محمد عبداللہ کے کردار کا سب سے نمایاں، قابل ذکر، قابل مواخذہ اور دلچسپ پہلو ان کے قول اور فعل گفتار اور کردار دعویٰ اور عمل کا گہرا تضاد ہے وہ جو کچھ کہتے ہیں۔ خود نہیں کرتے اور جس کا انہیں دعویٰ ہے، اس پر انہوں نے زندگی بھر عمل نہیں کیا ہے بلکہ میرا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کو جس بات کی تلقین یا نصیحت کرتے ہیں۔ خود ان کا عمل اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ بابائے قوم کی زندگی اور ان کے دعویٰ میں یہ گہرا تضاد اس درجہ نمایاں اور واضح ہے کہ بظاہر اس کی نشان دہی کی بھی ضرورت نہیں۔ لیکن اس قوم میں چونکہ ابھی تک ایسے افراد کی کمی نہیں کہ جو اندھی عقیدت اور شخص پرستی کے زیر اثرات کو دن اور سیاہ کو سفید کہنے پر مصر ہیں۔ اس لئے ''عظیم قائد'' کی زندگی کے اس پہلو پر قلم اُٹھانا ضروری بن گیا ہے ہم اور ہمارے آبا واجداد آج ۴۵ سال سے شیخ صاحب کی زبانی قناعت، سادگی، ضبط نفس اور فقر و استغنیٰ کی فضیلت ضرورت اور اہمیت پر لیکچر سنتے آئے

ہیں۔ ان کی ہر تقریر میں ان موضوعات پر خاص طور زور دیا جاتا ہے اور شیخ صاحب بار بار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی زندگی سے مثالیں پیش کر کے عوام الناس کو قناعت، سادگی اور ضبط نفس کا درس دیتے ہیں جو لوگ شیخ صاحب کو نہیں جانتے یا جنہیں ان کی ذاتی زندگی کے قریبی مشاہدے کی سعادت حاصل نہیں ہوتی، وہ بابائے قوم سے یہ اخلاقی مواعظ اور پند ونصائح سن کر اس درجہ مرعوب اور متاثر ہوتے ہیں کہ ان کی نگاہوں میں انہیں سیاسی لیڈر سے زیادہ مصلح قوم اور بزرگ دین کا مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن جن بدنصیبوں کو شیخ صاحب سے قربت اور ان کی ذاتی زندگی سے واقفیت کا زہر پینا پڑتا ہے۔ وہ قاید اعظم کے قول اور فعل میں ناقابل یقین تضاد کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ میں یہ بات کہہ کر کسی راز کا افشاء نہیں کر رہا ہوں کہ اپنی قوم کو قناعت سادگی اور درویشی اور قلندری کا درس دینے والے قاید کا اپنا لائف سٹائل بیک وقت مغل بادشاہوں اور لاٹ صاحبوں کا سا ہے۔ اور ان کے کھانے پینے، رہن سہن، لباس اور آرام و آسائش کے کسی پہلو میں اس قناعت، سادگی یا درویشی کی ایک جھلک بھی نظر نہیں آتی۔ کہ جس کی تلقین کرتے کرتے انہوں نے اپنی زندگی کے ۴۵ سال بڑے عیش و عشرت میں گذارے۔ گاندھی جی کا یہ عاشق اور ان کے خوابوں کا ہندوستان تعمیر کرنے والا یہ معمار، مغربی لباس، رہن، سہن اور طرز زندگی کا بھی بڑا زبردست عاشق ہے۔ اور اس کے معیار حیات کو دیکھ کر کوئی شخص یہ اندازہ نہیں کر سکتا۔ کہ کشمیری عوام کا یہ مقبول اور محبوب

رہنما ایک غریب کشمیری الاصل خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور اس نے اپنی زندگی کی ابتداء ساٹھ روپے ماہوار کی سرکاری ملازمت سے کی تھی ۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ ان کی اپنی زندگی میں قناعت وسادگی کے اس مکمل فقدان کے علاوہ شیخ صاحب کو ان لوگوں سے بھی ایک طرح کی نفرت اور وحشت ہوتی ہے۔ کہ جن کی زندگی فقر و استغنیٰ اور سادگی اور درویشی کا مثالی نمونہ ہے۔ مولانا مسعودی کے بارے میں انہوں نے بار ہا ''شکس لد'' کا لفظ اسی پس منظر میں استعمال کیا ہے، اس کے برعکس موہن سنگھ او برائے اور دھریندر برہمچاری سے شیخ صاحب کی دوستی اور ان کا لگاؤ؛ اس رکھ رکھاؤ اور آن بان کا مظہر ہے کہ جو انہیں بے حد پسند اور مرغوب ہے۔ حد یہ ہے کہ ہمارے محبوب قائد نے جیل میں بھی اپنے لئے عیش وعشرت اور آسائش کے وہ سامان فراہم کر لئے ، جو کہ ہمارے ہاں کے رئیسوں کو اپنے گھروں میں بھی مہیا نہیں ہیں۔ میں اس مرحلے پر یہ بتادوں ، کہ میں راہبانہ طرز زندگی کی وکالت نہیں کر رہا ہوں اور نہ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ شیر کشمیر غربت و افلاس کی زندگی بسر کریں میں صرف اس امر کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ انہیں جو چیز اور جو سٹائل دوسروں کے لئے ناپسند ہے، خود اپنے لئے وہ اسے نہ صرف پسندیدہ اور مرغوب خاطر سمجھتے ہیں بلکہ اس کے حصول کے لئے وہ قواعد وضوابط اصول اور آئین ہر چیز قربان کرنے پر بھی آمادہ رہتے ہیں۔

قول وفعل اور گفتار وکردار کے اس دلچسپ تضاد کی کچھ مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

موئے مقدس رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو آثار شریف حضرت بل

کی پرانی قیام گاہ سے نئی زیارت گاہ میں منتقل کرنے کے دن آثار شریف میں عقیدت مندوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔اس موقع پر اس تقریب کے ہیرو شیخ محمد عبداللہ کی دستار بندی کی گئی اور نئی زیارت گاہ کی تعمیر میں ان کی شاندار خدمات کو سراہا گیا۔حسب معمول اور حسب توقع شیخ صاحب نے زائرین سے خطاب فرمایا اور انہیں بلند اخلاق، ایثار اور عظمت وکردار کا درس دیا۔یہ غالباً چار پانچ ماہ پرانی بات ہے۔لیکن مجھے آج بھی ان کے سر پر سفید مخمل کا دستار اور ان کے نورانی چہرے کا اتار وچڑھاؤ اچھی طرح یاد ہے۔عام لوگوں کو ایثار، ضبط نفس اور خدا کی راہ میں سب کچھ لٹا دینے کی تلقین کرتے ہوئے شیخ صاحب نے حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کی زندگی سے ایک مثال دیتے ہوئے کہا۔

''ایک بار حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ پر سبقت لے جانے کی کوشش میں اپنی مال و جائیداد کا نصف حصہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا کہ اسے خدا کی راہ میں قربان کیا جائے حضرت عمرؓ کا خیال تھا کہ اپنی اس قربانی اور ایثار سے وہ اب کی بار حضرت ابو بکر صدیقؓ پر ضرور سبقت لے جائیں گے۔اور وہ اس خیال سے دل ہی دل میں خوش تھے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت عمرؓ سے دریافت کیا کہ تم نے اپنے گھر میں اپنے اور اہل و عیال کے لئے کیا رکھا ہے تو عمرؓ نے بڑے فخر سے جواب دیا۔کہ میں نے اپنے مال و جائیداد کا صرف آدھا حصہ بچایا ہے۔اور باقی آپ کی خدمت میں پیش کیا ہے۔کچھ دیر بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ

نے اپنا اثاثہ پیش کیا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بھی یہی سوال کیا کہ انہوں نے اپنے گھر اور اپنے بیوی بچوں کے لئے کیا کچھ بچایا ہے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا کہ میرے اور میرے بیوی بچوں کے لئے خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام کافی ہے دوسرے الفاظ میں انہوں نے اپنی ساری متاع خدا کی راہ میں قربان کرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کی تھی اور اس طرح ایثار وقربانی کے اس معرکے میں بھی انہوں نے حضرت عمرؓ پر سبقت حاصل کی یہ تھا ہمارے اسلاف میں قربانی ایثار اور راہ حق میں ایثار سب کچھ لٹانے کا جذبہ جو ہمیں اپنے اندر پیدا کرنا چاہئے۔"

قبلہ محترم کی طویل تقریر سے یہ اقتباس میں نے صرف اس لئے منتخب کیا ہے، کہ اس سے واقعی صحابہ کرام کی پاکیزگی، ان کے تقدس زہد وتقویٰ اور ایثار کا اندازہ ہو جاتا ہے، لیکن اب اس مثال اور اس تلقین کو ذہن میں محفوظ رکھ کر اس بات کا جائزہ لیجئے کہ اپنی قوم کو اپنے اندر اس قسم کا جذبہ پیدا کرنے کی دعوت دینے والے کا اپنا طرز عمل اور طرز زندگی کیا ہے؟

صرف سرینگر شہر میں قبلہ محترم کے ایک نہیں، چار مکان ہیں۔ اور ایک سے ایک بڑھ کر، ساری قوم کو زیر تعمیر میڈیکل انسی چیوٹ کے لئے دل کھول کر چندہ دینے کی اپیل کرتے ہیں، لیکن خود صورہ میں اپنا ذاتی مکان اسی انسٹی چیوٹ کو سترہ سو روپے ماہوار کرایہ پر دے رکھا ہے۔ اپنے رہائشی مکان میں رہنے اور اس کا فرنیچر استعمال کرنے کے لئے سرکار سے سالانہ

پچاس ہزار روپے سے زائد رقم وصول کرتے ہیں۔ چار لاکھ روپے سے بھی کم قیمت پر شہر کے سب سے اہم تجارتی مرکز میں دھن جی بھائی بلڈنگ، جس کی قیمت بیس پچیس لاکھ روپے سے کم نہ ہوگی جس طریقے سے شیخ صاحب نے حاصل کی ہے اس سے ایمانداری، دیانتداری اور دوستی کے ہر اصول اور تقاضے کی نفی ہوتی ہے۔ نئی دہلی کے کوٹلہ لین میں جو مکان انہیں تین سو روپے ماہوار کے رعایتی کرایے پر اس وقت دیا گیا تھا۔ کہ جب وہ وہاں نظر بند اور جلا وطن تھے۔ وہ شیخ صاحب نے آج تک واپس نہیں کیا ہے اور مرکزی سرکار کی مروت اور لحاظ کا استعمال کرتے ہوئے وہ آج بھی اس کا تین ہی سو روپے ادا کرتے ہیں۔ جبکہ اس کا عام کرایہ دو ہزار روپے سے زائد ہے، اس مکان کی انہیں قطعی کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن لالچ اور اثاثہ جمع کرنے کی فطرت اور جبلت کا کوئی منطقی اصول نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ بغیر ضروت اور بناء استعمال کئے اس مکان پر قابض ہیں۔ ایک حقیر سے اندازے کے مطابق اس وقت بابائے قوم کی غیر منقولہ جائیداد ساٹھ اور ستر لاکھ کے درمیان ہے اور انہوں نے انکم ٹیکس کو اپنی جائیداد کا جو گوشوارہ پیش کیا ہے، اس سے اس اندازے کے صحت کی تائید ہوتی ہے۔ میں اس مرحلے پر یہ سوال نہیں اٹھانا چاہتا، کہ کشمیری عوام کے محبوب قائد نے یہ ساری جائیداد کیوں اور کیسے حاصل کی۔ لیکن میں یہ ضرور جاننا چاہوں گا۔ کہ اس بھاری بھر کم جائیداد اور اپنی آمدنی سے وہ راہ حق میں کتنا کچھ خرچ کرتے ہیں؟ اپنی قوم کو حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے طرزِ عمل پر چلنے کی تلقین کرتے

ہوئے وہ خود ان اصولوں اور آدرشوں پر کہاں تک چلتے ہیں۔ میری اپنی ناچیز رائے میں انہوں نے یہ سارے اصول اوروں کے لئے وضع کئے ہیں۔ اور خود وہ اپنے آپ کو ان سے بلند اور مبرا سمجھتے ہیں۔ میں ایک بار پھر اس کی امر کی صراحت کردوں، کہ مجھے اس بات پر اعتراض نہیں کہ شیخ صاحب کے پاس اتنی دولت اور جائیداد کیوں ہے۔ لیکن اس بات پر اصرار ضرور ہے، کہ دوسروں کو راہ حق میں سب کچھ لٹا دینے والوں کی نصیحت کرنے والوں کو کم از کم اپنے کردار سے اپنے گفتار کی تائید اور تصدیق کرنی چاہیے۔

شیخ صاحب نے جب پچھلے سال مسز گاندھی کو سرینگر آنے کی دعوت دے کر اپنا ذاتی مہمان بنایا۔ تو ہم نے یہ سوال اُٹھایا تھا۔ کہ جس خاتون اور جس کے والد نے پورے ۲۲ سال تک کشمیری عوام کو جمہوری حقوق سے محروم کرکے ان پر لاٹھیاں اور گولیاں چلوائیں۔ اسے اپنی ذاتی مہمانی کا شرف بخش کر شیخ صاحب کیا ان شہیدوں، مظلوموں اور مجروموں کا اپمان نہیں کر رہے ہیں۔ کہ جو مسز گاندھی یا ان کے والد محترم کے دور اقتدار میں ان کے ظلم وستم کا شکار رہے، اس سوال کے جواب میں شیخ صاحب نے اخلاق اور عظمت کی بلندیوں کو چھوتے ہوئے یہ کہا تھا کہ "مسز گاندھی اور ان کے خاندان کے ساتھ ان کے برسوں پرانے ذاتی تعلقات ہیں۔ اور سیاسی اختلافات کے نام پر ذاتی تعلقات کو نظر انداز کرنا ان کا شیوہ نہیں۔ ہم ان کے اس جواب سے قائل تو نہیں۔ لیکن مرعوب ضرور ہوئے تھے، پھر کچھ عرصہ بعد وزیر اعظم مرار جی ڈیسائی تشریف لائے شیخ صاحب نے ان کی راہ

میں بھی آنکھیں بچھا ییں۔ اوران کا وہ شاہانہ استقبال کیا۔ کہ آج تک کسی وزیراعظم کا نہ ہوا ہوگا۔ ہم نے پوچھا کہ حضرت وہ اگر ذاتی تعلقات کے نام پر تھا۔ تو یہ کس خوشی میں؟ فرمایا میں نے مرارجی ڈیسائی کا نہیں۔ ہندوستان کے وزیراعظم کا استقبال کیا ہے۔ اور ایسا کرنا تو میرا فرض تھا؟ سرکاری استقبال تو ہماری سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن یہ دریائی جلوس اورشہری استقبالیے کیوں؟ جواب ملا کہ وہ موجودہ ہندوستان کے واحد گاندھیائی لیڈر ہیں اس مکالمے کو بہت طول دیا جاسکتا تھا۔ لیکن ہم نے شیخ صاحب کی ذاتی تعلقات کی تھیوری کو پرکھنے کے لئے اپنے بہترین اور عزیز ترین دوستوں کے تیئں ان کے رویے کا جائزہ لیا۔ تو معلوم ہوا کہ ان کا یہ دعویٰ بھی محض سیاسی مصلحت پسندی اور دکھاوا ہے۔ مسز اندرا گاندھی اور جواہرلال نہرو کے مقابلے میں بخشی غلام محمد، غلام محمد صادق، مولانا مسعودی، غلام محی الدین قرہ، مرزا محمد افضل بیگ کے ساتھ ذاتی مراسم زیادہ گہرے دیرپا اور مخلصانہ تھے، لیکن ان میں سے ہر دوست کے ساتھ سیاسی اختلافات کی بناء پر علیحدگی کے بعد شیخ صاحب نے ان کے ساتھ جو رویہ روا رکھا ہے اس سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ کہ وہ ''ذاتی دوستوں'' کے سلسلے میں زیادہ انتقام پسند اور بے مروت واقع ہوئے ہیں۔ مرزا محمد افضل بیگ سے ان کی دوستی دو چار سال نہیں، پورے پنتالیس سال پرانی ہے اور بیگ صاحب سے ہزار اختلافات کے باوجود مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں۔ کہ انہوں نے سیاست کا حق ادا کیا ہو یا نہیں۔ شیخ صاحب سے اپنی دوستی نبھانے میں کوئی دقیقہ فرد گذارشت نہیں

کیا۔لیکن اس کے باوجود جب فرضی سیاسی اختلافات اور مصنوعی سازش کی بناء پر شیخ صاحب اوران کے درمیان ایک خلیج پیدا ہوگئی۔اور بیگ صاحب کو شیخ صاحب کی کابینہ اور نیشنل کانفرنس سے نکل جانے پر مجبور کیا گیا۔تو اسی کے ساتھ شیخ صاحب نے بیگ صاحب کے ساتھ اپنے ذاتی تعلقات اور مروت کے سبھی رشتے بھی منقطع کردئے۔اب نہ صرف یہ کہ دونوں کے درمیان کوئی راہ ورسم نہیں۔ بلکہ شیخ صاحب اپنی زندگی بھر کے رفیق کے ساتھ یہ رعایت برتنے کے لئے بھی تیار نہ ہوئے کہ ان کے دو خادموں، رمضان اور رحمان کو ایک مہینے کی چھٹی دے دیتے۔ان دونوں غریبوں کو اپنے آقا سے وفاداری کے جرم میں سرکاری ملازمت سے برطرف کردیا گیا ہے۔اندرا گاندھی اور مرارجی ڈیسائی سے اپنے ذاتی تعلقات کے نام پر دوستی اور مروت کا رشتہ قائم کرنے والے شیر کشمیر کا اپنے اصلی دوستوں اور مہربانوں کے تئیں بے مروتی، سرد مہری اور انتقام گیری کا یہ رویہ ان کے قول و فعل کے تضادات کو نمایاں کرنے کے لے کافی ہے اس سلسلے کی کچھ اور مثالیں کسی آئندہ اشاعت میں پیش کروں گا۔

☆

۲۰/اپریل ۱۹۷۷ء

راز دان، بی، اے

ایک خط باتیں ہزار

قبلۂ محترم

آپ سے ملنے والے بہت سے دوستوں اور دشمنوں کا کہنا ہے، ان دنوں آپ بڑے شگفتہ موڈ میں ہیں۔ اور ہر ملنے والے سے بڑی خندہ پیشانی اور خوش اخلاقی سے پیش آتے ہیں۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ آپ نے اوقات فرصت میں پھر وہی شغل باغبانی شروع کر دیا ہے، کہ جو ایام نظر بندی میں آپ کی تفریح اور دلچسپی کا واحد ذریعہ تھا...... کہنے والوں کا کہنا ہے کہ اب آپ کی قیام گاہ کے باہر مجبوروں، حاجت مندوں اور ستم رسیدوں کا ہجوم نہیں رہتا۔ اور جس دروازے پر سرمایہ داروں، سرکاری افسروں اور بیرونی سیاحوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ وہاں اب سیکورٹی سٹاف کے سپاہی دن بھر تاش کھیلتے رہتے ہیں، سنا ہے کہ اب آپ بہت کم باہر آتے ہیں۔ اور جب آتے بھی ہیں تو سائرن بجاتی ہوئی وہ جیپ، جو آپ کے وزیر اعلیٰ بننے کے بعد آپ کی شخصیت کا حصہ بن گئی تھی۔ اب آپ کو اور شہر والوں کو پریشاں نہیں کرتی۔ کچھ ستم ظریفوں نے یہ افواہ بھی اُڑائی ہے، کہ سابق وزیر مملکت

برائے سپلائز خواجہ غلام محمد شاہ آپ سے اس لئے ناراض اور نالاں ہیں کہ آپ نے ڈیڑھ سال قبل ان کی کانگریس میں شامل ہونے کی تجویز نہیں مانی، اور اس طرح انہیں سرکاری موٹر، مفت پٹرول اور بہت سی دوسری مراعات سے محروم ہونا پڑا۔ کہا جاتا ہے کہ ٹورسٹ ڈیولپمنٹ کارپوریشن کی دکان میں لاکھوں روپے منافع کمانے کے بعد اب طارق صاحب دن بھر گھر پر بیٹھے یہ حساب کرتے رہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے اقتدار کے ڈیڑھ سال میں کل کتنے لوگوں کو بے کار اور بے روزگار بنا دیا ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق زینہ کدل کے متوصاحبان، ہر شام آپ کو جھوٹی، سچی خبریں سنا کر یہ تاثر دیتے رہتے ہیں، کہ شہر میں آئے دن جو ہنگامہ بپا رہتا ہے۔ وہ دراصل وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی کی شہ پر ہوتا ہے، اور مرکزی حکومت، آپ کے خلاف ایک بہت بڑی سازش میں مصروف ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ آپ کے متعلق کہی جانی والی یہ باتیں صحیح ہیں یا غلط؟...... اور اگر صحیح ہیں، تو پھر آپ پر ان تمام باتوں کا کیا اثر ہوتا ہے؟

محترم شیخ صاحب!

میں آپ کو یاد دلانا چاہوں گا کہ میں نے پچھلے دو سال کے دوران آپ کو کئی مرتبہ یہ احساس دلانے کی کوشش کی، کہ اقتدار تو ہر حال ایک عارضی شئے ہے، لیکن آپ کا اقتدار خاص طور پر مانگے کا اُجالا ہے۔ اور آپ کو ہر حال میں اس سے چمٹے رہنے کی بجائے اپنے سیاسی رول اور تاریخی

فریضے کو انجام دینے کی کوشش کرنا چاہئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب جب میں نے اس موضوع کو چھیڑ کر آپ کو تلخ حقائق سے آگاہ کرنے کی جسارت کی، آپ موضوع بدل بدل کر میری بات کو ٹالتے رہے۔ آپ کے عمل اور ردِ عمل سے یہ لگتا تھا، کہ آپ کو قسامِ ازل سے زندگی بھر وزیر اعلیٰ رہنے کی سند مل گئی ہے۔ مخصوص سیاسی صورت حال نے آپ کو گندی نالی کے ان کیڑوں، سے بھی بے نیاز کر دیا تھا۔ کہ جن کے سہارے آپ اقتدار کی کرسی پر جلوہ افروز ہو گئے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وزیر اعلیٰ بننے کے صرف چند ہی دنوں بعد آپ نے ہر مجلس، ہر محفل، ہر تقریب اور ہر تقریر میں یہ فلسفہ دہرانا شروع کر دیا۔ کہ ہمیں کچھ عرصے کے لئے سیاست کو چھٹی دے کر صرف تعمیر و ترقی کے کام میں محو ہو جانا چاہیے۔ میں نے اور قبلہ صوفی محمد اکبر نے آپ کے اس غلط اور خود فریبانہ فلسفے کے خلاف احتجاج کیا۔ اور آپ کو یہ بتانے کی کوشش کی، کہ صحت مند اور تعمیری سیاست کے بغیر تعمیر و ترقی کا کام آمروں اور شہنشاہوں کو زیب دیتا ہے عوامی لیڈروں اور سیاست دانوں کو نہیں۔ لیکن آپ کو ہماری یا کسی اور کی باتیں سننے کی فرصت ہی کہاں تھی۔ نتیجہ یہ کہ آپ اقتدار سے محروم ہونے کے چند دن پہلے تک اپنا ہی فلسفہ دہراتے رہے کہ سیاست کو چھٹی دو، اور پھر سیاست نے ایک دن آپ کی چھٹی کر دی!

شیر کشمیر!

اب جب کہ حالات کی گردش اور سیاست کی سازش نے آپ کو بے

پناہ مصروفیات سے فارغ کر کے آپ کی فرصت کے اوقات میں غیر معمولی اضافہ کر دیا ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ آپ کچھ وقت یہ سوچنے میں گذاریں کہ پچھلے دو ڈھائی سال کے دوران ایسی کون سی باتیں ہوئیں۔ کہ جن کی وجہ سے آپ کی شہرت اور مقبولیت کو نقصان پہنچا۔ سب سے آسان بات یہ ہے کہ آپ اپنی ہر ناکامی کے لئے اپنے دشمنوں اور مخالفوں کو ذمہ دار قرار دے کر اپنے دل اور اپنے دوستوں کو یہ تسلی دیں کہ آپ سے کوئی غلطی یا کوتاہی سرزد نہیں ہوئی ہے لیکن اس آسان نسخے سے درد کی شدت میں کمی تو ہوگی۔ لیکن بیماری کی صحیح تشخیص نہ ہو سکے گی بہتر یہ ہوگا کہ اپنے دشمنوں کی دشمنی اور ان کی سازشوں کا گلہ کرنے کی بجائے آپ اپنی اور اپنوں کی کوتاہیوں کا جائزہ لے کر موجودہ حالات کا تجزیہ کریں۔ سیاست میں کوئی چیز حرف آخر نہیں۔ اس لئے اپنے حال سے گھبرا کر اپنے مستقبل سے مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں بشرطیکہ جو بات شاعرِ مشرق علامہ اقبالؔ نے قوموں کے متعلق کہی ہے ۔وہ آپ اپنے اوپر بھی صادق کر دیں۔

صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر گھڑی اپنے عمل کا حساب

قائدِ اعظم!

یہ بہت دنوں کی بات ہے۔ غالباً تین سال پہلے کی، کہ آپ کے ایک بہت ہی دیرینہ دوست اور عقیدت مند نے مجھ سے یہ پوچھا کہ آج کل ریاست کی سیاست میں کیا ہو رہا ہے ان دنوں مرکزی حکومت کے ساتھ

آپ کی بات چیت چل رہی تھی۔ اور آثار و قرائین سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ مفاہمت کا آخری مرحلہ طے ہو رہا ہے میں نے جب آپ کے دیرینہ ساتھ اور عقیدت مند کو یہ خوشخبری سنائی۔ کہ آپ جلد ہی ایک بار پھر مسند وزارت پر جلوہ گر ہونے والے ہیں تو اس کا چہرہ اتر گیا، اور اس کی آنکھوں میں دنیا بھر کی مایوسی سمٹ آئی، اس نے انتہائی دردمندانہ لہجے میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "راز دان صاحب! شیخ صاحب پر یہ ظلم نہ کیجئے انہیں وزیراعظم نہ بنوایئے (ان دنوں آپ وزیراعلیٰ کی بجائے وزیراعظم کہلانے پر مصر تھے) انہیں سب کچھ آتا ہے۔ حکومت کرنا نہیں آتا۔ میں نے آپ کے ساتھی اور اپنے اس بزرگ کو یہ سمجھانے کی بڑی کوشش کی، کہ گذشتہ بیس بائیس سال کے دوران آپ بہت بدل گئے ہیں۔ اور اب کی بار آپ اپنے پچھلے تجربات کی روشنی میں اقتدار کے استعمال میں بہت محتاط ہوں گے۔ لیکن آپ کا یہ پرانا چاہنے والا اور جاننے والا اس بات پر بضدر ہا۔ کہ آپ کو سب کچھ آتا ہے حکومت کرنا نہیں آتا۔

میرے محترم قائد!

آپ کے اس ساتھی کا اندازہ اور اندیشہ صحیح ثابت ہوا ہے۔ آپ نے گذشتہ دو سال کے دوران جس بے دردی اور بے رحمی کے ساتھ اقتدار کا اوزار استعمال کیا ہے، اس نے مجھے بھی آپ کے دیرینہ ساتھی کا ہم خیال بنا دیا ہے اقتدار کے شیش محل میں قدم رکھ کر آپ یہ بھول گئے۔ کہ اب اس شیش محل پر ساری دنیا کی نگاہیں مرکوز ہیں۔ اور آپ جو کچھ کریں گے وہ نہ

صرف ساری دنیا کو نظر آئے گا۔ بلکہ دنیا بھر کی تنقید اور تنقیص کا موضوع بنے گا۔ آپ ایک لخت بھول گئے کہ آپ کا اقتدار بھی عوامی اعتماد کی بجائے کانگریس کی مصلحت پسندی کا تحفہ ہے، اور اس لئے آپ کو ہر ہر قدم پھونک کر رکھنا پڑے گا۔ اقتدار کی وردی پہنتے ہی آپ کی شخصیت اور سوچ میں عجیب و غریب قسم کی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ آپ نے گذشتہ بائیس تئیس برسوں میں نہ کچھ سیکھا ہے اور نہ بھلایا ہے آپ کی سب سے بڑی غلطی (بلکہ سب سے بڑا جرم) یہ ہے کہ آپ اقتدار کے ایوانوں میں داخل ہوتے ہی عام لوگوں سے اس درجہ دور ہو گئے کہ کسی عام آدمی کا آپ سے ملنا، اور آپ کو اپنا دُکھ درد سنانا، سب سے مشکل کام سمجھا جانے لگا۔ آپ کے گھر پر تو سیکورٹی سٹاف کا پہرہ رہتا ہی تھا۔ آپ نے سیکرٹریٹ میں بھی عام لوگوں کے داخلے پر پابندی عائد کر کے اپنی علیحدگی کو مکمل کر لیا۔ غضب یہ ہے کہ وزیر اعلیٰ بننے کے بعد آپ نے پہلی ہی عید کے دن باضابطہ یہ فرمان جاری کر دیا، کہ میرے گھر پر مجھے کوئی عید مبارک کہنے نہ آئے ...... آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے اس نادر شاہی حکم کے خلاف سخت احتجاج کر کے آپ کو یہ یاد دلانے کی کوشش کی تھی کہ ایسا کر کے آپ اپنے اور عوام کے درمیان بہت بڑی فصیل تعمیر کر رہے ہیں۔ لیکن آپ اقتدار کے نشے میں مجھ غریب کی کیا سنتے ؟

قائد اعظم !

آپ ویسے بھی اپنی خوش اخلاقی یا نرم روی کے لئے مشہور نہیں ہیں۔

لیکن وزیر اعلیٰ بننے کے فوراً بعد تو آپ نے غضب ہی کر دیا۔ اور آپ نے اپنی تلخ کلامی، تند مزاجی اور کاٹ کھانے کی روش سے ساری دنیا کو ناراض کر دیا۔

بقول غالبؔ

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات، اس نے شکایت ضرور کی

اب جبکہ آپ کے پاس نہ اقتدار ہے اور نہ اختیار، بلکہ فرصت ہی فرصت ہے کیا آپ اس بات پر غور کریں گے کہ آپ کی سرد مہری، بے نیازی، بے التفاتی اور تلخ کلامی نے آپ کی شخصیت کے جادو اور مقبولیت کو کس حد تک نقصان پہنچایا ہے۔ انسان بہر حال انسان ہے، وہ وزیر اعلیٰ بن کر بھی خدا نہیں ہوتا۔ اور ہر انسان کا ہر مسئلہ حل کرنا کسی وزیر اعلیٰ یا وزیر اعظم کے بس کی بات نہیں۔ لیکن خوش خلق خوش گفتار اور انسان دوست حاکم اپنے گفتار اور اپنے کردار سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ آپ نے اس کے برعکس اپنے دور اقتدار میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ناراض کر کے اپنے دوست کا یہ اندازہ صحیح ثابت کیا کہ آپ کو حکومت کرنا نہیں آتا۔ اب جبکہ حالات اور سیاست کی ملی جلی سازش نے آپ کو اقتدار سے محروم کر ہی دیا ہے۔ میں چاہوں گا کہ آپ دوبارہ اقتدار میں آنے کی کوشش بھی نہ کریں۔ کیونکہ صاحب اقتدار ہونے کے بعد آپ سب سے زیادہ نقصان اپنی شخصیت اپنی ذات اور اپنی سیاست کو پہنچاتے ہیں۔ یہ آپ

کے دوستوں اور دشمنوں کا مشترکہ فرض ہونا چاہیے۔ کہ وہ آپ کے دوبارہ صاحب اقتدار ہونے کی ہر کوشش کو ناکام بنائیں۔ سابق وزیر مملکت خواجہ غلام محمد شاہ کو میرا سلام عرض کریں۔

فقط

راز داں بی۔اے

☆

۲ نومبر ۱۹۷۷ء

عالمِ ارواح کی ڈاک

محترم شیخ صاحب کے نام تین خط

محترم شیخ صاحب!

ابھی ابھی داروغۂ جنت نے یہ خوش خبری سنائی کہ آپ کسی کارِ خیر میں شرکت کرنے کے لئے عزیزی بشیر کے گھر تشریف لے گئے تھے، جہاں آپ نے میری تصویر کو پھولوں کا ہار پہنا کر میری عزت افزائی کی۔ مجھے پہلے یقین تو نہیں آیا۔ لیکن داروغۂ جنت، چونکہ صدر الدین مجاہد کی طرح جھوٹ نہیں بولتا، اس لئے اس کی بات پر اعتبار کرنا ہی پڑا۔ میں یہ چند سطریں اظہارِ تشکر کے طور پر تحریر کر رہا ہوں۔ اور آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہاں سبھی احباب جن میں صادق صاحب ڈی، پی صاحب اور رشید، سبھی شامل ہیں آپ کے مزاج اور رویے میں اس خوشگوار تبدیلی سے بہت خوش ہیں۔ سیاسی معاملات میں اختلافات کی ہمیشہ گنجائش رہتی ہے۔ اس لئے ۱۹۵۳ء میں جو کچھ ہوا اس پر ہمیں نادم اور آپ کو ناراض ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ لیکن اس کے باوجود آپ نے ہمیں غدار، وطن دشمن اور

وطن فروش قرار دے کر ہمارے خلاف نفرت، بدظنی اور بے زاری پیدا کرنے کی جو مہم چلائی۔ اس نے ریاست کے سیاسی ماحول کو زہر سے بھر دیا تھا اور سیاست ذاتیات کے گورکھ دھندے میں اُلجھ کر رہ گئی تھی۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ پورے چوبیس برس بعد آپ خیالات، نظریات اور سیاست کے اعتبار سے وہاں لوٹ کر آئے۔ کہ جہاں ہم نے کھڑے ہو کر بار بار آپ کو پکارا تھا۔ وہاں سے آمدہ اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ بیک وقت اندرا گاندھی، برہما نند ریڈی اور سنجیوا ریڈی کا خیر مقدم کر کے کشمیر سے لے کر کنیا کماری تک ایک ہونے کی بات کرتے ہیں۔ مجھے یہ جان کر بھی خوشی ہوئی۔ کہ میں نے جن لوگوں کو اپنے دورِ اقتدار میں انجینئر، جج، کلرک اور پٹواری بنایا تھا۔ وہ آپ کی کابینہ میں وزیر ہیں۔ اور میری وزارت عظمٰی کے دوران جو افسران میرے پسندیدہ تھے۔ وہ آپ کے بھی پسندیدہ ہیں۔ ان تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے اور میرے درمیان ذہنی، فکری اور سیاسی سطح پر کوئی فرق یا اختلاف نہیں تھا۔ اور محض چند غلط فہمیوں کی بناء پر ہم ایک دوسرے سے دور ہو گئے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم بالآخر ایک ہو گئے ہیں۔ اور ہمارے خاندانوں کے درمیان جو کدورتیں اور غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ وہ اب دور ہو گئی ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ رقص و موسیقی سے اپنے جس شغف کی بناء پر مجھے آپ نے اور آپ کے دوسرے ساتھیوں نے بہت بدنام کر رکھا تھا، اس سے آپ کو بھی خاص دلچسپی ہو گئی ہے۔ اور آپ اچھی موسیقی اور عمدہ فن کاری سے اب متاثر ہونے لگے ہیں یہ بہت ہی اچھی اور

مبارک کی بات ہے۔ داروغۂ جنت کا کہنا ہے کہ ان دنوں مشہور گلوکارہ رونا لیلیٰ آپ کی دعوت پر کشمیر آئی ہوئی ہے اے کاش! مجھے بھی آواز کی دنیا کی اس جادوگرنی کا کمال دیکھنے کی سعادت حاصل ہوتی۔ بہر حال یہی کیا کم ہے کہ آپ اس کی آواز کے جادو سے متاثر ہو رہے ہیں۔ میری بات مانئے۔ تو ایک دن بمبئی کی شکیلہ بانو بھوپالی کو بھی بلوائیے وہ کم بخت واقعی ایک پٹاخہ ہے۔

یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ جہاں میرے سبھی دوست، آپ کے خصوصی حلقۂ احباب میں شامل ہیں۔ وہاں میرے سبھی دشمن، آپ کے عذاب اور عتاب کا شکار ہیں۔ میں اس دن کے انتظار میں ہوں کہ جب مولانا سعید محی الدین قرہ اور افضل بیگ کو آپ کی پولیس ہتھکڑیاں پہنا کر سنٹرل جیل لے جائے گی۔ خط کے اختتام پر ایک شکایت کی اجازت دیجئے، سنا ہے کہ جسٹس شہمیری کی صاحبزادی طاہرہ، میری بیگم خورشید کا حق مار کر ڈائریکٹر ایجوکیشن بنی بیٹھی ہیں۔ اور انہیں بہت تنگ کرتی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ ایسا نہیں ہونے دیں گے بیگم صاحبہ کو میرا آداب کہہ دیجئے۔

فقط

آپ کا پرانا ساتھی بخشی غلام محمد.

میرے محترم!

اُمید ہے کہ آپ کے مزاج بخیر ہوں گے، بخشی صاحب کو نہ معلوم وہاں کی خبریں کیسے موصول ہوتی رہتی ہیں۔ اور ان کے ذریعے وہاں کے

وطن فروش قرار دے کر ہمارے خلاف نفرت، بدظنی اور بے زاری پیدا کرنے کی جو مہم چلائی۔ اس نے ریاست کے سیاسی ماحول کو زہر سے بھر دیا تھا اور سیاست ذاتیات کے گورکھ دھندے میں اُلجھ کر رہ گئی تھی۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ پورے چوبیس برس بعد آپ خیالات، نظریات اور سیاست کے اعتبار سے وہاں لوٹ کر آئے۔ کہ جہاں ہم نے کھڑے ہو کر بار بار آپ کو پکارا تھا۔ وہاں سے آمدہ اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ بیک وقت اندرا گاندھی، برہمانند ریڈی اور سنجیوا ریڈی کا خیر مقدم کر کے کشمیر سے لے کر کنیا کماری تک ایک ہونے کی بات کرتے ہیں۔ مجھے یہ جان کر بھی خوشی ہوئی۔ کہ میں نے جن لوگوں کو اپنے دورِ اقتدار میں انجینئر، جج، کلرک اور پٹواری بنایا تھا۔ وہ آپ کی کابینہ میں وزیر ہیں۔ اور میری وزارت عظمیٰ کے دوران جو افسران میرے پسندیدہ تھے۔ وہ آپ کے بھی پسندیدہ ہیں۔ ان تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے اور میرے درمیان ذہنی، فکری اور سیاسی سطح پر کوئی فرق یا اختلاف نہیں تھا۔ اور محض چند غلط فہمیوں کی بناء پر ہم ایک دوسرے سے دور ہو گئے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم بالآخر ایک ہو گئے ہیں۔ اور ہمارے خاندانوں کے درمیان جو کدورتیں اور غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ وہ اب دور ہو گئی ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ رقص و موسیقی سے اپنے جس شغف کی بناء پر مجھے آپ نے اور آپ کے دوسرے ساتھیوں نے بہت بدنام کر رکھا تھا، اس سے آپ کو بھی خاص دلچسپی ہو گئی ہے۔ اور آپ اچھی موسیقی اور عمدہ فن کاری سے اب متاثر ہونے لگے ہیں یہ بہت ہی اچھی اور

مبارک کی بات ہے ۔ داروغۂ جنت کا کہنا ہے کہ ان دنوں مشہور گلوکارہ رونا لیلیٰ آپ کی دعوت پر کشمیر آئی ہوئی ہے اے کاش! مجھے بھی آواز کی دنیا کی اس جادوگرنی کا کمال دیکھنے کی سعادت حاصل ہوتی ۔ بہر حال یہی کیا کم ہے کہ آپ اس کی آواز کے جادو سے متاثر ہو رہے ہیں۔ میری بات مانئے۔ تو ایک دن بمبئی کی شکیلہ بانو بھوپالی کو بھی بلوایئے وہ کم بخت واقعی ایک پٹاخہ ہے۔

یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ جہاں میرے سبھی دوست، آپ کے خصوصی حلقۂ احباب میں شامل ہیں ۔ وہاں میرے سبھی دشمن، آپ کے عذاب اور عتاب کا شکار ہیں۔ میں اس دن کے انتظار میں ہوں کہ جب مولانا سعید محی الدین قرہ اور افضل بیگ کو آپ کی پولیس ہتھکڑیاں پہنا کر سنٹرل جیل لے جائے گی۔ خط کے اختتام پر ایک شکایت کی اجازت دیجئے ، سنا ہے کہ جسٹس شہمیری کی صاحبزادی طاہرہ، میری بیگم خورشید کا حق مار کر ڈائریکٹر ایجوکیشن بنی بیٹھی ہیں۔ اور انہیں بہت تنگ کرتی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ ایسا نہیں ہونے دیں گے بیگم صاحبہ کو میرا آداب کہہ دیجئے۔

فقط

آپ کا پرانا ساتھی بخشی غلام محمد.

میرے محترم!

اُمید ہے کہ آپ کے مزاج بخیر ہوں گے، بخشی صاحب کو نہ معلوم وہاں کی خبریں کیسے موصول ہوتی رہتی ہیں۔ اور ان کے ذریعے وہاں کے

تازہ ترین حالات کا علم ہوتا رہتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بخشی صاحب نے یہاں بھی اپنی خاص تکنیک استعمال کر کے داروغۂ جنت کو پھنسالیا ہے اوران کے ذریعے انہیں ہر بات کی اطلاع ملتی رہتی ہے۔ بہر کیف، یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ کہ ریاست کا موجودہ سیاسی ماحول پر امن ہی نہیں پر اُمید بھی ہے۔اور پردیش کانگریس سے آپ کے تعلقات اس درجہ استوار ہو گئے ہیں کہ نیشنل کانفرنس اور کانگریس اب یک جان دو قالب نظر آتے ہیں۔ میں اس مرحلے پر پرانی باتوں کا ذکر کر کے آپ کا موڈ اور ذائقہ خراب نہیں کرنا چاہتا، لیکن یہ کہے بغیر رہ بھی نہیں سکتا کہ تاریخ نے قدم قدم پر ہمیں صحیح اور آپ کو غلط ثابت کر دیا ہے۔آپ نے ۲۴ سال بعد جو راستہ اختیار کیا۔ وہ اگر آپ چوبیس سال پہلے اختیار کرتے ،تو صرف کشمیر ہی نہیں ، ہندوستان اور پاکستان بھی بہت سے مصائب مسائل اور مشکلات سے دوچار نہ ہوتے۔ بہر کیف، ان موضوعات پر بحث کا اب کوئی فائدہ نہیں۔لیکن اپنے تجربے اور اپنی غلطیوں سے سبق سیکھنا انسانی سرشت میں ہے اور مجھے اُمید ہے۔ کہ آپ کبھی کبھی اپنی تنہائیوں میں اپنے ''حال'' اور ہمارے ''ماضی'' پر غور کرتے رہیں گے۔

وادی سے آنے والی تازہ ترین اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ پنچایتی انتخابات میں آپ نے نہ صرف ہماری روایات کو قائم رکھا۔ بلکہ بعض مقامات پر انہیں آگے بھی بڑھایا۔ معلوم ہوا ہے کہ ان انتخابات میں آپ نے بخشی صاحب اور میری اپنی تکنیک کو ملا کر ایک نئی تکنیک ایجاد کی اور اس

ایجاد کی رُو سے دوسو ووٹوں کے مقابلے میں آٹھ ووٹ حاصل کرنے والا کامیاب قرار دیا جاتا ہے۔ اور دوسو ووٹ والا ناکام، اس طرح اس نادر تکنیک کے استعمال سے آپ نے وادی بھر کی پنچایتوں پر نیشنل کانفرنس کو قابض کر دیا ہے۔ ہم سب کے لئے یہ بات باعث اطمینان ہی نہیں، باعثِ مسرت بھی ہے۔ کیونکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ہمارے تجربات سے مکمل فائدہ اُٹھا کر کشمیری عوام کو ''صحیح جمہوریت'' کا مزا چکھا رہے ہیں۔

بخشی صاحب اور میرے درمیان کبھی کبھی یہ بحث چھڑ جاتی تھی، کہ آپ ان کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں یا میرے؟ لیکن پنچایتی انتخابات نے یہ بحث طے کر دی ہے اور ان سے یہ ثابت ہوا ہے کہ آپ بنیادی طور میرے تجربات اور میرے نسخہ جات سے فائدہ اُٹھا کر میرے ہی نقش قدم پر چل رہے ہیں۔

مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے مرار جی ڈیسائی کی نشہ بندی سکیم کو ٹھکرا کر ریاست میں شراب نوشی پر پابندی عائد کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ خدانخواستہ آپ ریاست میں نشہ بندی لاگو کرتے، تو میرے بیٹے رفیق پر کیا گذرتی، کہ جو شراب فروشی سے چار پیسے کما کر اپنا گذارہ کرتا ہے۔ اُمید ہے کہ آپ اسی طرح اس کے مفادات کا بھی خیال کرتے رہیں گے۔

میری طرف سے بیگ صاحب کو سلام کہہ دیجئے۔ سنا ہے کہ پنچایتی انتخابات میں انہوں نے بھی بڑے کرتب دکھائے ہیں۔

فقط

آپ کا صادق غلام محمد صادق

مائی ڈیر شیخ صاحب!

آپ کے بارے میں اطلاعات ملتی رہتی ہیں اور یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کی صحت اب ماشاء اللہ بہتر ہے۔ بخشی صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ نے اپنی کابینہ میں کل ملا کر ۲۴ آدم شامل کر لئے ہیں۔ مجھے بخشی صاحب کی بات کا تو یقین نہیں آیا۔ لیکن پھر جب صادق صاحب نے بھی اس کی تائید کی، تو میں مان گیا۔ مجھے یاد ہے کہ فروری ۱۹۷۵ء میں جب آپ نے اپنی چار رکنی کابینہ کا اعلان کیا تھا۔ تو اس وقت آپ نے اس مختصر کابینہ کا یہ جواز دیا تھا۔ کہ آپ کو ان چار کے علاوہ کوئی ایماندار نہیں ملتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے دو تین سالوں کے دوران ریاست میں ایمانداروں کی تعداد چار سے بڑھ کر چوبیس ہوگئی ہے۔ اس برق رفتار ترقی پر میری دلی مبارک باد قبول کیجئے۔ آپ کی کابینہ میں شامل کچھ لوگوں کو تو میں جانتا ہوں اور کچھ کے نام میں نے سنے ہیں۔ لیکن کچھ نام ایسے ہیں، جو میں نے پہلی بار سنے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ان کے حالات زندگی مرتب کر کے ہم تک پہنچا دئے جائیں۔ یہ خط ایک خاص مقصد کے لئے لکھ رہا ہوں۔ لالہ تیرتھ رام جی کی پارلیمنٹ ممبری کی معیاد ختم ہو رہی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ آپ کے بھی دوست ہیں۔ لیکن میرے بہت قریبی رشتے دار ہیں۔ اس لئے میں گذارش کروں گا۔ کہ انہیں تیسری بار راجیہ سبھا میں بھیجنے میں کوئی لیت و لعل نہ کریں۔ آپ کو خود معلوم ہے کہ لالہ جی نے اپنی ممبری کے دوران ریاست اور ملک کی سیاست میں کتنا اہم Contribution کیا ہے اور میں توقع

رکھتا ہوں کہ آپ ان کی خدمات کو نظرانداز نہیں کریں گے۔ بیگ صاحب کو ان کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔ اور وہ خود ان کو راجیہ سبھا میں بھیجنے کے لئے کوشاں ہیں۔ میری طرف سے میرے دوست صونم نربو کو میرا اسلام کہہ دیجئے، یہ سن کر خوشی ہوئی کہ انہوں نے کانگریس کی ٹکٹ پر انتخاب جیتنے کے صرف اڑھائی گھنٹے بعد نیشنل کانفرنس میں شمولیت کر کے اپنے لئے وزارت کا منصب حاصل کر لیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لداخی بھی بے حد ہوشیار ہو گئے ہیں۔ مگر معلوم نہیں کہ میرے اکبر لداخی کا کیا حشر ہوا؟

فقط

آپ کا مخلص

ڈی، پی، در

☆

مائی ڈیر شیخ صاحب!

آپ کے بارے میں اطلاعات ملتی رہتی ہیں اور یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کی صحت اب ماشاءاللہ بہتر ہے۔ بخشی صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ نے اپنی کابینہ میں کل ملا کر ۲۴ آدم شامل کر لئے ہیں۔ مجھے بخشی صاحب کی بات کا تو یقین نہیں آیا۔ لیکن پھر جب صادق صاحب نے بھی اس کی تائید کی، تو میں مان گیا۔ مجھے یاد ہے کہ فروری ۱۹۷۵ء میں جب آپ نے اپنی چار رکنی کابینہ کا اعلان کیا تھا۔ تو اس وقت آپ نے اس مختصر کابینہ کا یہ جواز دیا تھا۔ کہ آپ کو ان چار کے علاوہ کوئی ایماندار نہیں ملتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے دو تین سالوں کے دوران ریاست میں ایمانداروں کی تعداد چار سے بڑھ کر چوبیس ہوگئی ہے۔ اس برق رفتار ترقی پر میری دلی مبارک باد قبول کیجئے۔ آپ کی کابینہ میں شامل کچھ لوگوں کو تو میں جانتا ہوں اور کچھ کے نام میں نے سنے ہیں۔ لیکن کچھ نام ایسے ہیں، جو میں نے پہلی بار سنے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ان کے حالات زندگی مرتب کر کے ہم تک پہنچا دئے جائیں۔ یہ خط ایک خاص مقصد کے لئے لکھ رہا ہوں۔ لالہ تیرتھ رام جی کی پارلیمنٹ ممبری کی معیاد ختم ہو رہی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ آپ کے بھی دوست ہیں۔ لیکن میرے بہت قریبی رشتے دار ہیں۔ اس لئے میں گذارش کروں گا۔ کہ انہیں تیسری بار راجیہ سبھا میں بھیجنے میں کوئی لیت ولعل نہ کریں۔ آپ کو خود معلوم ہے کہ لالہ جی نے اپنی ممبری کے دوران ریاست اور ملک کی سیاست میں کتنا اہم Contribution کیا ہے اور میں توقع

رکھتا ہوں کہ آپ ان کی خدمات کونظر انداز نہیں کریں گے۔ بیگ صاحب کو ان کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔ اور وہ خود ان کو راجیہ سبھا میں بھیجنے کے لئے کوشاں ہیں۔ میری طرف سے میرے دوست صونم نربو کو میرا سلام کہہ دیجئے، یہ سن کر خوشی ہوئی کہ انہوں نے کانگریس کی ٹکٹ پر انتخاب جیتنے کے صرف اڑھائی گھنٹے بعد نیشنل کانفرنس میں شمولیت کر کے اپنے لئے وزارت کا منصب حاصل کرلیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لداخی بھی بے حد ہوشیار ہو گئے ہیں۔ مگر معلوم نہیں کہ میرے اکبر لداخی کا کیا حشر ہوا؟

فقط

آپ کا مخلص

ڈی، پی، در

☆

عالم ارواح کی ڈاک

شیر کشمیر کے نام خالد کشمیر کا اظہار تشکر

میرے پیارے شیر کشمیر!

۲۲ ستمبر سے ہمارے ہاں "جشن کشمیر" منایا جا رہا ہے۔ اور اس سلسلے میں آئے دن بڑی دلچسپ اور رنگا رنگ تقاریب منعقد ہو رہی ہیں۔ صادق صاحب ڈی، پی میں اور رشید مرکزی کمیٹی کے ممبران ہیں اور ۱۹۵۳ء کے بہت سے شہید کلچرل سب کمیٹی کے رکن ہیں۔ جشن کشمیر منانے کی تجویز ڈی پی کے زرخیز دماغ میں اس وقت آئی کہ جب آکاش کی وانی نے یہ خبر دی کہ آپ نے مرزا محمد افضل بیگ کو نہ صرف بہ یک بینی دو گوش حکومت اور نیشنل کانفرنس سے نکال باہر کر دیا۔ بلکہ اُس پر ۱۹۵۳ء کی سازش کو دہرا کر اقتدار پر قابض ہونے کے منصوبے بنانے کا الزام بھی عائد کیا۔ یہ سن کر ہم کس درجہ مسرور و مسحور ہوئے۔ اس کو الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے اور اس عالم سرور میں ہم نے غیر معین عرصے تک جشن کشمیر منانے کا فیصلہ کیا۔ ۴ /اکتوبر گول باغ کے جلسہ عام میں آپ کے طوفانی دستے کے ہاتھوں مرزا افضل بیگ کی درگت کا حال احوال سن کر قوالی، مشاعرے اور رقص و سرور کی ایک خصوصی محفل بھی منعقد ہوئی۔ جس کے اختتام پر سپیشل سٹاف کے غلام قادر گاندربلی

نے ایک قرارد پیش کی، کہ آپ کو اپنی تازہ کامیابیوں اورزبردست فتوحات کے لئے مبارکباد دی جانا چاہئے۔آپ کے بہت پرانے دشمنوں، مولوی عبداللہ وکیل، ان کے فرزندوں مولوی عبدالرحیم اور ایم اے صابر، غلام نبی گلکار، عبدالسلام ایتو اور محمد یوسف قریشی نے اگرچہ اس قرارداد کی مخالفت کر کے ایک متبادل قرارداد میں آپ کے تازہ رول کی مذمت کی تھی۔لیکن ہم نے اس قرارداد کو ناکام بنانے کے لئے وہی حربے استعمال کئے۔کہ جو آپ نے گول باغ میں مرزا افضل بیگ کے جلسے کو درہم برہم کرنے کے لئے ۴ اکتوبر کو استعمال کئے۔نتیجہ یہ کہ مرزا بیگ اور ان کے ساتھیوں کی طرح مولوی عبداللہ اور محمد یوسف قریشی اس وقت اپنے زخموں کی مرہم پٹی میں مصروف ہیں۔اور ہم آپ کو گاندربلی صاحب کی پیش کردہ قرارداد کا مسودہ بھیج رہے ہیں۔

ہمارے راج دُلار!

ہم نہیں جانتے کہ آپ کا کس زبان سے اور کن الفاظ میں شکریہ ادا کریں، بارگاہ یزدی میں ہم نے پہلے ہی دن اپنی صفائی پیش کر کے اپنی بے گناہی اور بریت کی سند حاصل کی تھی۔لیکن اس کے باوجود ہم دنیا والوں کی نگاہوں میں معتوب، گنہگار اور خطا کار تھے اور وہ ہمیں برابر سازشی، بے وفا، دغا باز اور محسن کش سمجھتے تھے۔اور ہماری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔کہ ہم دربارِ خداوندی کے فیصلے کو کس طرح عالم خاکی میں مشتہر کردیں۔ہماری بے بسی اور بے کسی دیکھ کر مشیت یزدی اور رحمت خداوندی جوش میں آئی۔اور رب

العزت نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ کام آپ ہی کے ذریعے انجام دیا جائے گا اور آپ پچھلے تین سال سے جو کچھ کر رہے ہیں اسی فیصلے کی تکمیل اور تائید میں کر رہے ہیں اور جس خوبی سے آپ یہ فرض انجام دے رہے ہیں۔ اس کے لئے ہم سب لوگ آپ کے شکر گذار اور احسان مند ہیں۔ یقین کیجئے کہ اپنے اعمال، اپنے کردار اور کارکردگی سے آپ نے ہمیں نہ صرف بے گناہ اور بے قصور ثابت کر دیا ہے بلکہ جان کی امان پاؤں، تو یہ بھی عرض کر دوں۔ کہ اکثر لوگوں کی نگاہوں میں ہمارا عمل، ہمارا کردار اور ہماری کارکردگی، آپ کے مقابلے میں زیادہ شریفانہ اور مہذبانہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آج وہ لوگ بھی ہمیں دعائیں دے رہے ہیں کہ جو ہماری زندگی میں ہمیں فرعون کے سوا کسی دوسرے نام سے پکارنے کے روادار نہ تھے ہمیں اُمید ہے کہ اگر آپ نے اور آپ کے خاندان کے دوسرے افراد نے اپنی کوششیں اسی رفتار سے جاری رکھیں تو لوگ جلد ہی ہماری قبروں پر زیارت گاہیں بنا کر ہمیں اور ہمارے آباؤ اجداد کے لئے دعائے خیر کرتے نظر آئیں گے۔

ایشیاء کے بلند ستارے!

مرزا افضل بیگ کے ساتھ آپ نے جو کچھ کیا ہے، جو کچھ کر رہے ہیں اور جو کچھ کرنے والے ہیں اس سے ہمارے وہ سبھی زخم مندمل ہو گئے ہیں کہ جو ۲۵ برس کی مدت گذر جانے کے بعد بھی ابھی ہرے تھے۔ اس کم بخت نے اپنی وفاداری کا ناٹک اور اپنی چالاکی کا ڈھونگ رچا کر، ہمیں ساری دنیا کی نظروں میں ذلیل کر دیا تھا۔ لوگ یہ پوچھتے تھے۔ کہ جب افضل بیگ جیسا

زیرک ، پڑھا لکھا اور قانون دان آپ کے ساتھ نباہ کر سکتا ہے۔ آپ کا وفادار اور تابعدار رہ سکتا ہے اور آپ کے ہر دُکھ درد میں آپ کا ساتھ دے سکتا ہے۔ تو پھر بخشی غلام محمد اور اس کے ساتھیوں کی غداری اور بے وفائی مسلمہ ہے۔ ہماری زندگی میں ہمارے پاس اس سوال اور استدلال کا کوئی معقول جواب نہ تھا۔ لیکن ہماری موت کے بعد آپ نے اس سوال کا جواب دے کر ہماری روح کو آسودہ اور ہمارے مخالفوں کی دلیلوں کو فرسودہ ثابت کر دیا ہے۔ مرزا محمد افضل بیگ پر ۱۹۵۳ء کے سازش میں شریک ہونے کا الزام عائد کر کے، آپ نے ہماری معلومات میں بھی اضافہ کر دیا۔ ڈی پی آپ کے انکشاف سے حیران نہیں، لیکن پریشان ضرور ہو گیا۔ اس کا خیال ہے کہ یہ راز صرف اسے معلوم تھا۔ اور وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ آپ پہ یہ راز کس نے افشاء کر دیا۔ صادق صاحب کا خیال ہے کہ بیگ پر یہ الزام بالکل غلط ہے۔ کیونکہ ۱۹۵۳ء میں آپ کو گمراہ کرنے کی ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی ہے۔ مجھے اس بات سے دلچسپی نہیں، کہ یہ الزام صحیح ہے یا غلط، مجھے تو اس بات کی خوشی ہے کہ آپ نے ۱۹۵۳ء کے انقلاب میں اپنے واحد ساتھی کو ذلیل کر کے ہمارے اس دعویٰ کو صحیح ثابت کر دیا۔ کہ ۹ راگست ۱۹۵۳ء کو آپ حکومت اور تنظیم دونوں کا اعتماد کھو چکے تھے۔ ہم پر اکثر یہ الزام عائد کیا جاتا تھا کہ ہم نے ۹ راگست کے بعد ممبران اسمبلی کو دباؤ، تشدد اور لالچ سے اپنا وفادار اور طرف دار بنا لیا۔ لیکن ۲۲ ستمبر کے بعد سے آپ نے جو کچھ کیا اور جو کچھ کر رہے ہیں۔ اس سے نہ صرف ہمارا طرزِ عمل اور طریق کار صحیح اور جائز

قرار پایا ہے بلکہ آپ کے مقابلے میں ہم ناتجربہ کھلاڑی اور اناڑی سیاست دان ثابت ہوئے ہیں۔ ہم نے دولت کا لالچ دے کر اپنے مخالف ممبروں کو اپنا ہم نوا بنالیا۔ اور آپ نے لاٹھی، مکّے، دھکے اور دھمکی سے کام لے کر اپنا کام نکالا۔ آپ کا طریقہ یقیناً خاص ارزاں ثابت ہوا ہے اس میں شک نہیں کہ ۱۹۵۳ء میں ہمیں بھی اپنے موقف کو صحیح ثابت کرنے کے لئے آپ کے خلاف کچھ غلط پروپگنڈا کرنے اور غلط الزامات عائد کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور حق یہ ہے کہ ہم اپنی اس زیادتی کے لئے کسی حد تک شرمندہ اور نادم تھے۔ لیکن آپ جس بے دردی اور بے رحمی کے ساتھ اپنے ۴۵ سالہ وفادار ساتھی پر بے تحاشا الزامات اور اتہامات کی بارش کر رہے ہیں۔ اس سے ہمارا احساس گناہ بھی مٹ گیا ہے اور جھوٹ بولنے میں ہم پر آپ کی فوقیت بھی مسلم ہوگئی ہے۔ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق آپ نے بھی بیگ پر بیرون ریاست کی طاقتوں سے گٹھ جوڑ کا الزام عائد کیا ہے اسی پر بس نہ کیجئے۔ اس کم بخت پر بیک وقت چین، جاپان، امریکہ، چیکوسوالیہ اور ہنگری کے ساتھ مل کر آپ کے اور غلام محمد شاہ کے خلاف سازش کی تہمت عائد کیجئے۔ ہم تینوں کا خیال ہے کہ بیگ ان تمام ممالک سے مل کر سازش کرنے کا اہل ہے۔

شیر کشمیر پیارے!

ہمارے عہد کے ممبران اسمبلی اس بات کے لئے بدنام اور رسوا تھے،
کہ وہ ہمارے حکم کے غلام تھے۔ ان کی وفاداریاں محض اقتدار کے مرکز سے

منسوب تھیں۔ یہ بات کسی حد تک صحیح بھی تھی لیکن آپ کے ممبران اسمبلی نے اپنے کردار، گفتار اور ایک جگہ سے دوسری جگہ تک بھاگنے کی رفتار سے ہمارے عہد کے ممبران اسمبلی کی عزت وتکریم بھی بحال کردی ہے۔ ہمارے دور کے کسی ممبر اسمبلی نے صرف چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر تین بار اپنی وفاداریاں بدلنے اور مختلف بیانات دینے کا ریکارڈ قائم نہیں کیا ہے، لیکن آپ کے تیلیوں اور مولویوں نے ۲۴ گھنٹوں میں دوبار دل بدلی کا ایک نیا عالمی ریکارڈ قائم کرکے آپ کی شہرت میں غیر معمولی اضافہ کردیا ہے۔ اور اس کے لئے ہم اور ہمارے سبھی ساتھی، آپ کو اور آپ کے ممبران اسمبلی کو دعا دیتے ہیں کہ وہ اسی طرح اپنے لیڈروں کو دغا دیتے رہیں۔ مرزا افضل بیگ کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہ یہ شکایت کررہے ہیں کہ آپ لوگ زور زبردستی اور ماردھاڑ کے ذریعے ان کے ممبران کو ورغلا رہے ہیں۔ ہماری رائے میں ان کے اس احتجاج اور آہ وپکار پر کوئی کان دھرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ نیشنل کانفرنس کی شاندار روایات، اس کے اعلیٰ اصولوں کی حفاظت اور کشمیریوں کو عزت وآبرو کا مقام عطا کرنے کے لئے اگر چند ممبران اسمبلی کی ہڈی پسلی ہاتھ پاؤں کھوپڑی ٹوٹ بھی جائے تو کیا پروا۔ ہم نے بھی یہی کچھ کیا ہے۔ آپ بھی یہی کچھ کررہے ہیں اور میں یہ کہہ کر کوئی مبالغہ نہیں کروں گا۔ کہ اپنے عہد میں ڈاکٹر فاروق اور غلام محمد شاہ بھی یہی کریں گے۔ غلام قادر گاندربلی صاحب اس سلسلے میں خصوصی طور پر عرض کرتے ہیں کہ تھانہ کوٹھی باغ میں ان کی وہ استری بھی پڑی ہوئی ہے، کہ جس

سے وہ اپنے دور اختیار میں محاذ رائے شماری سے وابستہ افراد کے ذہنوں کی شکنیں دور کیا کرتے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ آپ کو مرزا بیگ اور اپنے دوسرے سیاسی مخالفوں کے جسموں اور ذہنوں کی شکنیں دور کرنے کے لئے اس استری کا بھی استعمال کرنا چاہیے۔ صادق صاحب اس تجویز کے حق میں نہیں۔ لیکن ڈی پی کو یہ تکنیک استعمال کرنے میں کوئی اعتراض نہیں بلکہ اس کا خیال ہے کہ آپ نے ہمارا مشورہ موصول ہونے سے پہلے ہی اس پر عمل درآمد شروع کر دیا ہوگا۔

ماسٹر جی!

یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ نے گاندھی جی کے جنم دن پر گاندربل میں اپنے پچاس سالہ پرانے معلّمی کے پیشے کی ایک جھلک دکھا کر کچھ بالغوں کو تعلیم دینے کی رسم افتتاح بھی انجام دی ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو اپنی استادی کا ثبوت مہیا کرنے کے لئے یہ ناٹک رچانے کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ ۴ را کتوبر کو گول باغ میں مرزا افضل بیگ کے جلسۂ عام کو پتھروں کی بارش سے درہم برہم کروا کر آپ نے حتمی طور پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ آپ استادوں کے استاد ہیں اور غنڈہ گردی اور ہلڑ بازی کے جو سبق ہم نے آپ کی قیادت میں پڑھے ہیں اور جن کو ہم نے اپنے اپنے عہد میں آزمایا تھا وہ سب اب زائد المعیاد ثابت ہوئے ہیں ہمارا طریقہ تو یہ تھا کہ ہم لوگوں کو اپنے مخالفوں کے جلسہ گاہ میں جمع ہی نہیں ہونے دیتے تھے مگر آپ نے ایک نئی طرز ستم ایجاد کی ہے آپ جمع ہونے تک مخالفوں کے سٹیج سجانے تک اور

پھر جلسے کی کاروائی شروع ہونے تک کچھ نہیں کرتے۔ لیکن جلسہ شروع ہوتے ہی آپ کے غازی پتھروں کی بارش کر کے چالیس پچاس ہزار کے ہجوم کو جس طرح تتر بتر کر دیتے ہیں۔ اُس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ہماری تکنیک' کی بجائے براہ راست بابائے فاسزم شیر جرمنی، قائد اعظم جناب ایڈلف ہٹلر صاحب کے طریق کار سے متاثر ہیں۔ اور آپ اہل کشمیر کو عزت و آبرو کا مقام عطا کرنے کے لئے اس عظیم قائد کے نسخے استعمال کرر ہے ہیں۔ یہ صورت حال کشمیری عوام کے لئے کتنی ہی تکلیف دہ اور افسوس ناک کیوں نہ ہو۔ میرے لئے بالخصوص اور میرے دوسرے ساتھیوں کے لئے بے حد مبارک اور مسرت افزا ہے۔ جس قوم نے میری محبت مروت انسانیت، شرافت اور شائستگی کو غنڈہ گردی اور زور زبردستی کا نام دے کر میرے جیتے جی مجھے رسوا کیا۔ میری خواہش ہے کہ اس قوم کو آپ کے کردار، عمل اور آپ کی جمہوریت سے اس بات کا سبق مل جائے کہ آپ کے سبھی پیشرو آپ کے مقابلے میں زیادہ مہذب۔ جمہوریت پسند اور انسانیت دوست تھے۔ میری اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے آپ جس خلوص اور تندہی سے تعاون کرر ہے ہیں۔ اس کے لئے صرف میں ہی نہیں رشید اور مجید دونوں ہی آپ کے شکر گذار ہیں۔ شیخ غلام قادر گاندربلی آپ کو اور خاص طور پر خواجہ غلام محمد شاہ کو سلام عرض کرتے ہیں۔ ہم سب اُمید کرتے ہیں کہ مرزا افضل بیگ کے خلاف آپ کی جنگ اور جدوجہد میں کمی کے بجائے روز بروز شدت آجائے گی کم از کم مرزا افضل بیگ کو تو یہ معلوم ہونا چاہئے۔ کہ وہ ۴۵

برس کس فریب اور کس بُت کی پوجا کرر ہے تھے۔ بہت دنوں سے عزیزی طارق کے بارے میں کوئی خبر موصول نہیں ہوئی ہے۔ کیا انہوں نے کشمیری عوام کو عزت و آبرو عطا کرنے کا کام ملتوی کر دیا ہے۔ یہ سن کر خوشی ہوئی کہ آپ نے آئندہ سے نائب وزیر اعلیٰ کا عہدہ ہی ختم کر دیا ہے۔ اس طرح اب آپ کو اپنے اقتدار کے باقی دس پندراں سال آرام سے گذارنے کا موقع ملے گا۔

فقط

آپ کا ایک دیرینہ ساتھی

غلام محمد بخشی

☆

نومبر ۱۹۷۸ء

عالم خاک کی ڈاک

بخشی غلام محمد مرحوم کے نام:-

محترم بخشی صاحب!

''آئینہ'' کے ذریعے کبھی کبھی آپ کی خبر و خیریت کا احوال معلوم ہوتا رہتا ہے۔ یہ جان کر بڑی مسرت ہوئی، کہ آپ وہاں اپنے تمام ساتھیوں سمیت ''جشن کشمیر'' کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ، آپ کو تا قیامت خوش وخرم رکھے۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ آپ یہاں کے حال احوال سے پوری طرح واقف ہیں یا نہیں اور اگر ہیں تو پھر اس کے متعلق آپ کے کیا تاثرات ہیں؟ لیکن قیاس غالب ہے کہ آج کل جو کچھ یہاں ہو رہا ہے۔ اس سے آپ کی روح خوش ہو رہی ہوگی۔

اے کاش! آپ کو ایک بار، صرف ایک بار، صرف چند دن کے لئے اس عالم خاکی کا دورہ کرنے کی اجازت ملتی۔ اور آپ اپنی آنکھوں سے شیر کشمیر کے جاہ وجلال اور ان کی حکومت کے کمال کا نظارہ دیکھتے۔

بہر حال! آپ کے پرستاروں اور جان نثاروں کے لئے یہ بات کچھ کم باعث اطمینان اور قابلِ فخر نہیں، کہ آپ پر غداری اور قوم فروشی کا الزام عائد کرنے والے ایک ایک گنہگار کو اس کے کئے سزا مل گئی ہے یا مل رہی

ہے۔ مولانا مسعودی ہوں یا محی الدین قرہ، بلراج پوری ہوں یا علی محمد نائیک، غلام قادر بیگ ہوں، یا مرزا محمد افضل بیگ جس شخص نے بھی آپ پر محسن کشی شب خون اور غداری کا الزام عائد کیا۔ اسے شیر کشمیر نے اپنے مبارک ہاتھوں سے ذلیل اور رسوا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذارشت نہیں کیا ہے۔ مولانا مسعودی پر ۱۹۵۳ء کی سازش میں شریک ہونے کا الزام تو بہت پرانا ہے۔ لیکن مرزا افضل بیگ پر اس مبینہ سازش میں شرکت کی تہمت عائد کر کے شیخ صاحب نے اپنی زندگی میں ہی آپ کو ہر الزام سے بری کر دیا۔ اور مرزا بیگ نے ۱۹۵۳ء کے واقعات کو سازش کی بجائے نظریاتی کشمکش کا نام دے کر آپ کی سیاسی بصیرت، عاقبت اندیشی اور اخلاقی جرأت پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ خود شیخ صاحب کے اطوار کردار، گفتار اور ان کی موجودہ رفتار سے ۱۹۵۳ء میں آپ کے حیرت مندانہ رول کی تائید اور تصدیق ہوتی ہے اور اب کسی شخص میں یہ ہمت باقی نہیں کہ وہ ۱۹۵۳ء میں یا اس کے بعد آپ کے سیاسی رول پر انگلی اٹھا سکے بقول شاعر۔

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانوں سے

آپ کو یہ جان کر بڑی خوشی ہو گی کہ آپ کے سبھی دوست، احباب اور رشتے دار بڑے مزے میں ہیں۔ بلکہ ان میں سے اکثر لوگ ان دنوں شیر کشمیر کے وزیر، مشیر اور سفیر بنے ہوئے ہیں۔ ٹھاکر دیوی داس، پیارے لال ہنڈو، صونم نربو، ڈاکٹر ہربجھن سنگھ، میاں بشیر اور بودھ راج بالی، آپ کے یہ سبھی چہیتے آج کل شیر کشمیر کے لاڈلے اور صلاح کار بنے ہوئے ہیں

سرکاری افسروں میں بھی آپ ہی کے پسندیدہ افسران، شیخ صاحب کے منظورِ نظر ہیں۔ اس کے برعکس سیاسی اور سرکاری دونوں سطحوں پر آپ کے مخالف تباہ و برباد، پریشان اور نالاں ہیں۔ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق مرزا بیگ کے رشتے داروں اور ان کے منظور نظر افسروں کو زبردست ہراسان کیا جارہا ہے۔ اور خود بیگ صاحب کی کوٹھی کو سی، آئی، ڈی والوں نے اس طرح اپنے نرغے میں لے رکھا ہے۔ کہ جس طرح آپ کے دور میں شیخ صاحب کی کوٹھی رہا کرتی تھی۔ یہ بات تو آپ کو معلوم ہو ہی چکی ہوگی۔ کہ حکومت اور تنظیم دونوں پر شیخ صاحب کے خاندان نے مکمل قبضہ کر رکھا ہے۔ اور ریڈیو کشمیر کے ہر بلیٹن سے پہلے شیخ صاحب پھر بیگم صاحبہ، پھر خواجہ غلام محمد شاہ، اس کے بعد ڈاکٹر فاروق عبداللہ، شیخ عبدالرشید اور آخر میں طارق عبداللہ کی سرگرمیوں کی خبریں نشر ہوتی ہیں۔ سرینگر سے پہلگام تک کا سفر ہیلی کاپٹر میں طے کیا جاتا ہے۔ اور آپ کو یہ سن کر یقیناً تعجب ہوگا کہ شیخ صاحب اور شاہ صاحب دونوں کو اپنے مکان میں رہنے کے لئے الگ سے ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔ اس قسم کا قانون خالقِ دوجہاں کے لئے بھی باعث حیرت اور موجب پریشانی ہوگا۔ لیکن اس سے کہہ دینا کہ وہ پریشان نہ ہوں۔ کیونکہ یہ پیسہ خوراک پر دی جانے والی سبسڈی میں بچت سے ادا کیا جاتا ہے آپ کے دس سالہ دور اقتدار پر دو سال تحقیقات کرنے کے بعد آئینگر کمیشن نے یہ فتویٰ دیا تھا۔ کہ بخشی خاندان نے پچاس لاکھ کی جائیداد بنائی ہے اور اس خاندان میں آپ کے سبھی بھائی بند وشامل تھے۔ اپنے

شیر کشمیر نے اقتدار کے دو ڈھائی سالوں میں ہی ستر اسی لاکھ کی حدود سے تجاوز کر لیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ انہیں صحت کامل اور عمر دراز عطا کرے، تو آئندہ تین چار سال کے دوران وہ دو کروڑ روپے کی حد پار کریں گے۔ آپ کو یہ اطلاع اس لئے دے رہا ہوں۔ کہ آپ اپنے ساتھیوں، صادق ڈی پی ور اور رشید کے علاوہ یہ خبریں ان تمام شہیدوں تک پہنچا دیں کہ جن سے شیخ صاحب نے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی قوم کو عزت و آبرو عطا کرنے کے لئے جدوجہد کریں گے۔ ان سے کہہ دیجئے کہ شیخ صاحب اور ان کے خاندان کو عزت و آبرو ہی نہیں، دولت بے داد بھی مل گئی ہے۔ اور ان کے خاندان میں بقول ان کے کشمیر کے چالیس لاکھ لوگ شامل ہیں۔ اس لئے بالواسطہ طور پر کشمیری عوام کو حق خود ارادیت نہ سہی، عزت و آبرو اور خوشحالی مل گئی ہے۔

فقط

میں ہوں آپ کا ایک پرستار

خواجہ غلام محمد صادق کی خدمت میں

محترم صادق صاحب!

''آئینہ'' میں کبھی کبھی بخشی صاحب کے خطوط پڑھنے کو مل جاتے ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ وہاں بھی اپنی کاہلی، آرام طلبی اور کتاب بینی کی روایات قائم کئے ہوئے ہیں۔ آپ کے اس عالم خاکی سے روانہ ہو جانے کے بعد ہندوستان اور کشمیر کی سیاست میں کیا کیا بھونچال آئے ان کی تفصیل اس خط میں بیان کرنا مشکل ہے۔ مختصراً عرض یہ ہے کہ شیخ صاحب

نے اب بخشی صاحب کو غدار، سازشی اور نا قابل اعتبار کہنا ترک کر دیا ہے۔ اور اب ان کی ساری توجہ مرزا محمد افضل بیگ پر مرکوز ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بخشی صاحب کے تئیں ان کے رویے میں نرمی آنے کے باوجود آپ کے بارے میں ان کا لہجہ ابھی تلخ بھی ہے اور تُند بھی اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ آپ نے ہمیشہ نظریاتی بنیاد پر ان سے اختلاف کیا ہے۔ ابھی دو تین ماہ قبل انہوں نے آپ کے بارے میں یہ کہا تھا کہ ''صادق بدبودار، کمیونزم کی نمائندگی کرتا تھا اور لوگوں کو کمیونزم کا سبق پڑھا کر خود شاہانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ معلوم نہیں کہ آپ تک اس تقریر کی رپورٹ پہنچی یا نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ شیخ صاحب کی اس تقریر کو اُسی خندۂ زیرلبی کے ساتھ نظر انداز کر جائیں گے، کہ جس طرح آپ بیگ صاحب کے تازہ ترین تازہ ترین ارشادات پر مسکراتے ہوں گے، لیکن شیخ صاحب کا آپ کو بدبودار کمیونزم کی نمائندگی کا طعنہ دینے پر ان تمام لوگوں کو حیرت ہے کہ جو آپ کو اور ان کو دونوں کو اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ شیخ صاحب کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ انہیں نہ خوشبودار کمیونزم کے بارے میں کچھ معلوم ہے اور نہ بدبودار کمیونزم سے کوئی واقفیت، لیکن اس کے باوجود وہ اس انداز سے فتویٰ صادر کرتے ہیں کہ جیسے وہ علم و فضل کے معاملہ میں حرفِ آخر کی حیثیت رکھتے ہوں۔ جس شخص نے زندگی بھر کوئی سنجیدہ کتاب تو کیا، ایک فلمی رسالہ یا جاسوسی ناول بھی نہ پڑھا ہو۔ وہ جب پڑھے لکھے لوگوں پر طعنہ زنی کرے، تو حیرت ہوتی ہے۔ بہرکیف! آپ لوگوں کو شیخ صاحب کی کسی بات، بیان یا

انکشاف پر حیران یا ناراض ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ مرد بزرگ اپنی عمر کی اس منزل کو پہنچ گیا ہے، کہ جہاں انسان اپنے ہی خاندان کو ساری کائنات سمجھ کر اپنے عقلِ کل ہونے کا دعویٰ کرنے لگتا ہے۔

آپ کو یہ سن کر افسوس ہوگا کہ آپ کا صاحبزادہ رفیق غلط صحبت میں پڑھ کر بہت غلط قسم کی سیاست میں اُلجھ گیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کو اس بات سے کتنی تکلیف ہوگی کہ رفیق بنسی لال، سنجے گاندھی، وی سی شکلا اور گنڈو رام کی طرح اندرا گاندھی کی آمریت اور اس کی ذاتی حکومت کا پر چارک بنا ہوا ہے۔ بہر حال، ابھی بچہ ہے۔ شاید سنبھل جائے، آپ بھی کل پرسوں، خواب میں آکر، اسے سمجھانے کی کوشش کیجئے۔ کہ بے اصول اور غلط کار سیاست سے پرہیز کرے۔

فقط

میں ہوں آپ کا ایک مدّاح

درگا پرشاد در کے نام

ڈیر ڈی، پی

کیا بتاؤں کہ آپ کے جانے کے بعد زندگی کتنی ویران اور اُداس ہوگئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ آپ کو ملکی اور ریاستی سطح پر آنے والے واقعات کا کچھ کچھ اندازہ تھا۔ اور اسی لئے آپ قبل از وقت چھٹی لے کر اس عالم خاک وباد سے اُٹھ گئے۔ پچھلے تین چار سال سے ریاستی سیاست کے سٹیج پر ایسے ایسے ناٹک کھیلے جا رہے ہیں کہ آپ ہوتے تو ہنستے ہنستے دوہرے ہو جاتے۔

خاص طور پر ریاستی اسمبلی میں عبدالغنی ویری، عبدالسلام دیوا، عبدالصمد تیلی، محی الدین شاہ، شیخ منصور کی تقریریں سن سن کر آپ لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ اور آپ کو حیرت ہوتی کہ بابائے قوم نے ریاستی اسمبلی کو کن کن نادر تحفہ جات سے نوازا ہے۔آپ کا ایک یار صونم زربو شیر کشمیر کی کابینہ میں وزیر اور دوسرا یار چیف سیکرٹری ہے۔ البتہ لالہ تیرتھ رام کے ساتھ تعلقات میں وہ پہلی سی ہمواری اور استواری نہیں۔اور بیگ صاحب کے اخراج کے بعد معاملہ کچھ اور پیچیدہ ہو گیا ہے۔سید میر قاسم کے متعلق سنا ہو گا، کہ شیخ صاحب نے اس کے تمام احسانات کا بدلہ چکا کر ان کی جگہ خواجہ مبارک شاہ کو راجیہ سبھا میں بھیج دیا ہے۔آپ کا بیٹا کمار، ماشاءاللہ آپ ہی کی طرح بڑا سمجھ دار اور دور اندیش ہے۔شہر کے سبھی اخبارات کو اشتہارات دیتا ہے۔لیکن ''آئینہ'' کو کسی نہ کسی بہانے سے ٹال دیتا ہے۔تا کہ شیخ صاحب ناراض نہ ہوں۔ بہر حال، بیٹا آپ کا ہے اس لئے ڈپلومیسی میں اس کا مقابلہ کون کر سکتا ہے اِدھر ہندوستان میں مرارجی ڈیسائی نے نشہ بندی کا قانون بڑی سختی سے شروع کر دیا ہے۔ آپ کے ہاں کیا حال ہے؟

فقط

آپ کا ایک دوست

بخشی عبدالرشید کی خدمت میں

پیارے رشید!

اُمید ہے کہ عالم ارواح میں قدم رکھتے ہی آپ کی صحت ٹھیک ہو گئی

ہو گی۔آپ تو خوش قسمت تھے۔کہ موزون وقت پر اس دنیا سے چلے گئے۔ ہم وہ بدقسمت ہیں ، کہ ہمیں آپ کی جگہ خواجہ علی شاہ کے صاحبزادے محی الدین شاہ کو نیشنل کانفرنس کا سیکرٹری تسلیم کرنا پڑ رہا ہے۔معلوم نہیں کہ آپ اس چھوٹے شاہ سے واقف ہیں یا نہیں۔لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس شاہ نے ریاستی عوام کے ذہنوں سے آپ کی یاد محو کر دی ہے۔تحریر تقریر کردار اور گفتار کے اعتبار سے شاہی خاندان کا یہ شاہ آپ، کا ڈپلی کیٹ ہے، فرق صرف یہ ہے کہ آپ کے دربار میں بڑے بڑے وزیر اور حاکم حاضری دیا کرتے تھے۔اور شاہ صاحب علی الصبح وزیروں اور حاکموں کے درباروں کا طواف کر کے اپنے عزیز و اقارب کی سفارشیں کرتے پھرتے ہیں۔

آپ کو یہ سن کر خوشی ہو گی۔کہ موجودہ نیشنل کانفرنس پنچایت میونسپل کمیٹی اور ٹاؤن ایریا کمیٹیوں کے انتخابات میں آپ ہی کے آزمائے ہوئے نسخے استعمال کر رہی ہے۔اور ووٹوں کی چوری کے انتظام کی نگرانی بابائے قوم بہ نفسِ نفیس انجام دیتے ہیں۔

فقط

آپ کا ایک یار

☆

۷/ اکتوبر ۱۹۷۰ء

بخشی عبد الرشید کے قلم سے

اس ہفتے کی ڈاک سے ہمیں ایک دلچسپ خط موصول ہوا ہے جسے ہم من وعن تیسرے صفحے پر شائع کر رہے ہیں۔ چراغ بیگ

محترم چراغ بیگ!

میں نے گذشتہ چھ سات سال کے دوران کسی قسم کی سیاسی سرگرمی میں کوئی حصہ نہیں لیا ہے اور نہ آئندہ سیاست میں حصہ لینے کا کوئی ارادہ ہے۔ غلط یا صحیح، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں، کہ کرکٹ اور فٹ بال کی طرح سیاست کے بھی کچھ آداب اور ضابطے مقرر ہونا چاہئیں۔ اور جب ایک کھلاڑی اس کھیل میں ہار جائے، تو اسے اپنی شکست تسلیم کر کے کھیل کے میدان سے ہٹ جانا چاہیے۔ گذشتہ چھ سات سال سے میری علیحدگی اور خاموشی کا یہی جواز ہے۔ میں سمجھتا ہوں، کہ بدلے ہوئے سیاسی حالات میں میرا رول ختم ہو گیا ہے۔ اور اسی لئے میں اب تنہائی اور گمنامی کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ یقین کیجئے، کہ اس زندگی میں جو سکون، اطمینان اور راحت مجھے نصیب ہے، وہ اس سے پہلے کبھی حاصل نہیں رہا ہے۔

میں آپ کے اخبار کا بڑی باقاعدگی سے مطالعہ کرتا ہوں اور باوجود اس کے کہ آپ کے قلم نے میری صورت کو مسخ کرنے اور میرے خلاف زہر اگلنے میں کبھی کسی قسم کا بخل نہیں کیا ہے۔ میں آپ کی جرأت، بے باکی، صاف گوئی اور دیانتداری کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آپ کے خیالات، سیاسی عقائد اور نقطہ نظر سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، لیکن آپ کی تحریر وتقریر کے جادو سے انکار ممکن نہیں۔ "آئینہ" کی گذشتہ چند اشاعتوں میں، آپ پیر غیاث الدین سے برسرِ پیکار ہیں۔ اور اس سلسلے میں کئی بار میرا بھی ذکر خیر ہوا ہے۔ آپ نے جان بوجھ کر غیاث الدین صاحب سے میرے متعلق پوچھا ہے کہ ان کی میرے بارے میں کیا رائے ہے۔ اور یہ کہ ان کے سیاسی عروج میں میرا کتنا حصہ ہے؟ مجھے معلوم نہیں، کہ انہوں نے آپ کے ان سوالات کا کیا جواب دیا ہے۔ (میں ان کا اخبار پڑھنے کی سعادت سے محروم ہوں) لیکن ان سوالات سے مجھے آپ کے نام یہ خط لکھنے کی تحریک ہوئی ہے اور باوجود اس کے کہ میں نے کسی قسم کی سیاسی بحث یا سرگرمی میں حصہ نہ لینے کا عہد کیا ہے۔ میں آپ کے نام یہ چند سطریں لکھ کر ایک لحاظ سے اپنی توبہ توڑ رہا ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ ان میں کسی قسم کی ترمیم یا تحریف کیے بغیر انہیں اپنے اخبار میں شائع کر دیں گے۔ میں اپنی سیاسی زندگی کے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوں۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے، کہ بہت سے دوسرے سیاسی کارکنوں کی طرح مجھ سے بھی بہت سی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ مجھے اس بات سے بھی انکار نہیں، کہ میرے

بہت سے فیصلے غلط تھے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں، کہ اپنے عروج کے زمانے میں عام لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی عام لوگوں سے دور تھا۔ میں اپنی غلطیوں، کوتاہیوں، کمزوریوں اور محرومیوں کا جواز تراشنے کی کوشش نہیں کرتا، مجھے اپنی بے بضاعتی، کم مائیگی، اور تہی دامنی کا احساس ہے۔ اور میں اپنے گناہوں کے لئے دوسروں کو قصوروار گرداں کر اپنا دامن بچانے کو بدتر از گناہ سمجھتا ہوں۔ لیکن یہ دیکھ کر مجھے واقعی حیرت ہورہی ہے، کہ کچھ لوگ کس طرح تاریخ کو دھوکہ دینے کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بھی فریب دینے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ اور دلچسپ بات یہ ہے، کہ ایسے لوگوں میں اکثریت اُن احباب کی ہے، کہ جو میرے بہت قریب رہ چکے ہیں۔ اور جن کے بارے میں، میں سب کچھ جانتا ہوں۔ یہ الگ سوال ہے، کہ آج یہی دوست میرے نام پر تبرا پڑھنے میں پیش ہوتے ہیں! افسوس یہ ہے، کہ میرے پاس آپ جیسا قلم نہیں، کہ میں ان سبھی دوستوں کی قلمی تصویر کھینچ کر دنیا کے سامنے پیش کرتا، کہ ترقی پسندی، سوشلزم جمہوریت اور ایماندار کے ان علمبرداروں کی اصل حقیقت کیا ہے؟ آپ نے جو سوالات پیر غیاث الدین سے پوچھے ہیں، معاف کیجئے، کہ یہی سوالات اور بھی بہت سے ''صاحبانِ اقتدار'' سے پوچھے جاسکتے ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے، کہ ان میں سے کسی سیاسی 'لیڈر' میں اتنی اخلاقی جرأت موجود نہیں ہے، کہ وہ ان سوالات کا دوٹوک جواب دے یہ وہ لوگ ہیں کہ جو میرے عروج کے زمانے میں مجھے چاروں پہر گھیرے رہتے، جو صبح سے شام تک میری خوشامد کرکے

اپنے سیاسی وجود کو زندہ رکھنے کا جتن کرتے۔ جو میری ہر غلطی پر واہ، واہ کے نعرے بلند کر کے مجھے حقیقتِ حال سے بے خبر رکھنے کی سازش میں مصروف رہتے جو میری ہر ادا پر قربان ہو کر مجھے اپنی وفاداری کا یقین دلانے کی کوشش کرتے، جو میرے ہر فیصلے کا جواز تراش کر مجھے یہ اطمینان دلاتے، کہ میں نے جو کچھ کیا ہے، ٹھیک کیا ہے۔ اور جو کچھ کہا ہے، ٹھیک کہا ہے۔ میں اپنی غلطیوں کا جواز تراشنے کی کوشش نہیں کرر ہا ہوں۔ لیکن اس بے رحم حقیقت کی طرف اشارہ کرر ہا ہوں، کہ آج جو لوگ بخشی غلام محمد کے سب سے بڑے نکتہ چین بنے بیٹھے ہیں۔ وہ صرف سات سال قبل میرے قصیدہ خواں اور بخشی غلام محمد کے بہت بڑے مداح تھے۔ مجھے اپنی سیاسی زندگی کا ایک بھی ایسا واقعہ یاد نہیں کہ جب پیر غیاث الدین جیسے لوگوں نے میرے سامنے میری کسی بات سے اختلاف کا اظہار کیا ہو۔ بلکہ واقعہ یہ ہے، کہ اگر کبھی کوئی کارکن دبی زبان میں میرے کسی فیصلے سے بے اطمینانی کا اظہار کرتا تو غیاث صاحب مارکس اور لینن کا حوالہ دے کر میرے فیصلے کو صحیح ثابت کرتے اور بچارے کارکن کا منہ بند ہو جاتا۔ میری سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ میرے ساتھیوں میں غیاث صاحب جیسے ایم، ایل، بی اور ترقی پسند لیڈروں کی تعداد بہت تھی، لیکن یہ سب کے سب چاپلوس، خوشامدی اور تھالی کے بینگن تھے، ان لوگوں نے میرے اردگرد ایک ایسی فصیل قائم کر دی تھی، کہ میرے لئے اس سے باہر دیکھنا تقریباً ناممکن تھا۔

آپ نے غیاث صاحب سے دریافت کیا ہے، کہ کیا انھوں نے

کبھی میرے جوتے کے تسمے باندھے ہیں؟ یہ بہت ہی نازک سوال ہے اور میرا خیال ہے، کہ اس قسم کے سوال نہیں پوچھے جانے چاہئیں، لیکن میں جانتا ہوں، کہ یہ سوال پوچھنے سے آپ کی مراد غیاث صاحب کی تذلیل نہیں، بلکہ انہیں اپنا ماضی یاد دلانا ہے میں آپ کو یہ یقین دلانا چاہتا ہوں، کہ میرے جوتوں کے تسمے باندھنے کی سعادت صرف غیاث صاحب ہی کو حاصل نہیں رہی ہے، موجودہ حکومت کے کئی وزیروں اور سفیروں کو بھی یہ شرف حاصل تھا۔ اور آپ کو شاید اعتبار نہ آئے، کہ کئی بار یہ وزیر اور سفیر اس بات پر آپس میں لڑ پڑتے تھے، کہ میرے جوتے کے تسمے کون باندھے گا۔ ایک واقعہ اس وقت بھی میرے ذہن میں تازہ ہے ۱۹۶۲ء کے انتخابات کا زمانہ تھا۔ دن بھر انتخابی مہم میں حصہ لے کر شام کو ہم میر غلام حسن گیلانی کے ہاں گئے، وہاں انہوں نے پر تکلف چائے کا اہتمام کیا تھا۔ میرے ساتھ بہت سے دوست واحباب تھے۔ اتفاق سے چائے کی پیالیاں کم پڑ گئیں۔ میں نے چائے ختم کی۔ میری جھوٹی پیالی میں چائے پینے کے لئے دو سرکردہ لیڈر آپس میں لڑنے لگے۔ ان دو میں سے ایک کا نام پیر غیاث الدین تھا!

یہ اور اس قسم کے سینکڑوں واقعات میرے ذہن میں تازہ ہیں کہ کس طرح یہ لوگ اکثر مجھے اِس غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے، کہ میں کارل مارکس، لینن، خرشچوف اور جواہر لال نہرو سے کسی طور کم نہ تھا۔ آپ یقین نہیں کریں گے، کہ یہ "دانشور" جو آج کل اپنی دانشوری اور ترقی پسندی کا ڈھنڈورا پیٹ کر بخشی غلام محمد کے خلاف بہتان تراشیاں

کرتے پھرتے ہیں۔ ان میں سے اکثر دانشور صبح سویرے آکر میرے حقے میں پانی بھرلیا کرتے تھے اور دن میں کئی بار میرے کھدّر کے کپڑوں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے تھے، کئی بار انکی چاپلوسی سے تنگ آکر میں انہیں بُری طرح ڈانٹتا اور دھتکارتا، مگر خدا گواہ ہے، کہ اس ذلت کے باوجود ان لوگوں نے میرا کبھی دامن نہیں چھوڑا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، کہ صادق صاحب کے ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس بنانے کے بعد جب کچھ ساتھی نیشنل کانفرنس سے الگ ہو گئے، تو غیاث الدین صاحب مارکس اور لینن کے حوالے دے دے کر صادق صاحب اور ان کے ساتھیوں کو سامراجی ایجنٹ ثابت کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے، اور دلچسپ بات یہ ہے، کہ آج غیاث الدین صاحب، صادق صاحب کے قائم کردہ پولیٹکل سکول میں کارکنوں کو سیاسی تربیت دینے پر مامور ہیں۔

آپ نے غیاث صاحب سے یہ دریافت کیا ہے، کہ ان کے سیاسی عروج میں میرا کتنا حصہ ہے؟ مجھے یقین ہے، کہ غیاث صاحب اس سوال کا جواب نہیں دیں گے، اور اگر دیں بھی، تو ایمانداری سے نہیں دیں گے، اس لئے ان سے یہ سوال پوچھنا بے کار ہے، لیکن آپ کے اطمینان کے لئے میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں، کہ غیاث الدین اور اس کے بہت سے ساتھیوں کے سیاسی عروج کا گناہ عظیم مجھ سے سرزد ہوا ہے۔ میں نے کارکنوں کی مرضی کے خلاف اور بخشی صاحب کی ہدایات کو نظر انداز کر کے انہیں سیاسی مرتبہ اور حیثیت دی۔ اور باوجود اس کے ان میں نہ تنظیمی صلاحیت تھی اور نہ سیاسی

اہلیت، میں نے اپنی انا کی تسکین کے لئے ان مُردوں کو زندگی بخشی، مجھے اِس بات کا اعتراف ہے، کہ ان بڑے بڑے انگریزی خوانوں کو اپنے اشاروں پر نچا کر مجھے ایک عجیب سی لذت محسوس ہوتی تھی!

آپ کو شاید یاد ہوگا، کہ ۱۹۶۳ء میں کامراج پلان کے تحت بخشی صاحب کے استعفیٰ کے بعد یہی وہ لوگ تھے، کہ جنہوں نے پارٹی لیڈر کیلئے صادق صاحب کے انتخاب کی سخت مخالفت کی۔ مخالفت کرنے والوں میں محمد ایوب خان، عبدالغنی گونی، نور محمد بھی شامل تھے، لیکن غیاث صاحب کی مخالفت کا انداز ہی نرالا تھا۔ وہ صادق صاحب کی جگہ دینا ناتھ مہاجن یا پریم ناتھ ڈوگرہ کو وزیر اعظم بنانے کے حق میں تھے۔ ان تمام باتوں کو یاد تازہ کرنے میں، میرا مقصد صرف یہ ہے، کہ کس طرح بعض لوگ عوام کے کمزور حافظے پر اعتماد کر کے دنیا کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ بخشی صاحب کی اصولی مخالفت کوئی جرم نہیں یہ تو سیاسیاست کی بنیاد ہے اور وہ لوگ بخشی صاحب کی بُرائی کریں، کہ جو ابتداء سے ہی ان کے مخالف رہے ہیں، تو میری سمجھ میں بات آسکتی ہے، لیکن غیاث الدین جیسے لوگ، جو بخشی صاحب کے جھوٹے برتن میں کھانا کھانے کو اپنی زندگی کی معراج سمجھتے تھے، وہ بے وقت ان پر گند اچھالیں، تو کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے، کہ اقتدار سے وابستہ رہنے کے لئے خوشامد اور جھوٹی تعریف کے حربے استعمال کرنا غیاث صاحب جیسے لوگوں کی شریعت میں جائز ہے، لیکن یہ کیا ضروری ہے، کہ اپنے ہر محسن اور مشفق کی بُرائی کر کے اپنی وفاداری کا یقین دلانے کی

کوشش کی جائے۔غیاث صاحب یہ کیوں بھولتے ہیں، کہ پچھلے پندرہ سولہ سال میں ان کی شخصیت کا ہر پہلو اس درجہ بے نقاب ہو گیا ہے، کہ ترقی پسندی کی کوئی نقاب ان کے وجود کی سیاہیوں کو نہیں چھپا سکتی۔ معاف کیجیے، آپ کے نام میرا خط قدرے طویل ہو گیا۔ میں ایک بار پھر اس بات کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں، کہ میں کسی سیاسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا، یہ چند سطور صرف اس لئے تحریر کر رہا ہوں، کہ ''پاکئ داماں'' کی حکایت سنانے والے ماضی بعید کو نہ سہی، ماضی قریب کو تو یاد رکھیں۔اُمید ہے کہ آپ کے مزاج بخیر ہوں گے۔والسلام

بخشی عبدالرشید

☆

۴ مئی ۱۹۷۶ء

جمہوریت میں لاقانونیت

امریکہ میں سراغ رسانی کی مختلف ایجنسیوں کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لئے امریکی سینٹ کی ایک خاص کمیٹی نے جو رپورٹ مرتب کی ہے۔ اس کے مطالعے کے بعد یہ فیصلہ کرنا مشکل بن جاتا ہے کہ امریکی جمہوریت اور امریکی معاشرے کی تعریف کی جائے یا اس پورے نظام کو مردُود اور مطعون قرار دے کر امریکی عوام سے اظہار ہمدردی کیا جائے۔ سینٹ کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں سنٹرل انٹیلیجنس ایجنسی (سی، آئی، اے) اور فیڈرل بیورو آف انوسٹی گیشن (ایف، بی، آئی) کی گذشتہ چالیس سالہ کارکردگی کا جائزہ لیتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ دونوں ایجنسیاں بدترین قسم کی لاقانونیت، غنڈہ گردی اور بدعنوانیوں کا ارتکاب کرتی رہی ہیں اور انہوں نے لاکھوں امریکیوں کی زندگی تباہ و برباد کرنے میں ناجائز سے ناجائز کاروائی کرنے میں کبھی کوئی تامل نہیں کیا۔ اس سلسلے میں سینٹ کمیٹی نے جو انکشافات کیئے ہیں۔ ان سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ امریکی حکومت، ایک حکومت نہیں، پیشہ ور بدمعاشوں اور غنڈوں کے ایک ایسے گروہ کا نام

ہے کہ جو امریکی عوام کے خلاف ایک مسلسل سازش میں مصروف ہے۔ اس تحقیق و تفتیش کا سب سے تکلیف دہ اور عبرتناک پہلو یہ ہے کہ سُراغ رساں ایجنسیوں کی اس غنڈہ گردی میں امریکہ کے پانچ صدر (جن میں روز ویلٹ اور آیزن ہاور بھی شامل ہیں) بھی براہ راست شریک تھے، سراغ رسان ایجنسیوں کی اندرون ملک سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے لئے سینٹ کی خصوصی کمیٹی کا قیام، کمیٹی کا اپنی رپوٹ مرتب کرنے کے لئے پورے چودہ مہینے تک ہر ممکن ذریعے کا استعمال کرنا، یہ دونوں باتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ امریکی جمہوریت میں حکومت کا کوئی شعبہ، عوامی احتساب کی زد سے محفوظ نہیں۔ لیکن اس سے زیادہ قابل تعریف اور قابل تقلید بات، اس کمیٹی کی رپورٹ کا شائع کیا جانا ہے۔ امریکی نظام اور اس کے معاشرے پر اس سے زیادہ سنگین اور خطرناک تنقید کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی اشاعت اس بات کا ثبوت ہے کہ امریکہ میں پریس کی آزادی اور ملک کی آزادی، دو متضاد تصورات نہیں بلکہ ایک دوسرے کی توسیع اور تفسیر ہیں اور جمہوریت اور مطلق العنانیت میں یہی ایک بنیادی فرق ہے۔

ملک کی سلامتی اور سالمیت کے نام پر اور بہت سے ملکوں میں معلوم نہیں حکومتیں کیا کیا کچھ کررہی ہوں گی۔ لیکن ان ممالک میں تحقیقات تو الگ، حکومت کی کارکردگی یا پالیسیوں پر رائے زنی کرنا بھی جرم متصور ہوتا ہے، امریکی سینٹ کی رپورٹ نے جہاں امریکی جمہوریت کے کھلے کردار کو نمایاں کردیا ہے۔ وہاں اس میں درج انکشافات سے یہ بات بھی

واضح ہوگئی ہے کہ جمہوری نظام کے جسم میں بھی بدترین قسم کی مطلق العنانیت اور لاقانونیت کی رُوح پرورش پاسکتی ہے، اور جمہوریت کے بڑے بڑے دعویدار بھی اپنے اقتدار کے تحفظ کے لئے بڑے سے بڑے جرم کا ارتکاب کرنے سے گریز نہیں کرتے، امریکہ کو آج بھی دنیا کی سب سے عظیم جمہوریت ہونے کا دعویٰ ہے، لیکن اس کے باوجود پچھلے چالیس سال سے وہاں جو کچھ ہوتا رہا ہے۔ اس کی روشنی میں اسے جمہوریت کی بجائے لاقانونیت کا نام دینا زیادہ موزوں ہوگا۔

امریکی نظام جمہوریت اور فرد کی آزادی پر اعتقاد رکھنے والے تمام لوگوں کے لئے ایک تازیانۂ عبرت ہے کہ کس طرح جمہوریت کے استحکام اور اس کی بقا کے لئے مسلسل نگہداشت اور سخت عوامی احتساب کی ضرورت ہے۔ جہاں جہاں حکومت پر عوام کی گرفت کمزور پڑ جاتی ہے۔ وہاں وہی کچھ ہوتا ہے جو پچھلے چالیس برسوں سے امریکہ میں ہوتا آیا ہے۔ امریکی حکومت کی ان بے راہ رویوں پر غیض وغضب کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں ان تمام حالات پر بھی نظر رکھنی چاہئے کہ جو اس قسم کے نظام کو پنپنے کی اجازت دیتے ہیں۔

☆

نومبر ۱۹۶۹ء

احمد آباد کے فسادات

''یکم اکتوبر ۱۹۶۹ء کو سرینگر میں ریاستی اسمبلی کا پندرہ روزہ اجلاس شروع ہوا، اس روز وزیرِاعلیٰ خواجہ غلام محمد صادق نے احمد آباد کے ہولناک فرقہ وارانہ فسادات پر افسوس اور احتجاج کا اظہار کرنے کے لئے ایوان میں ایک قرارداد پیش کی، قرارداد پر تقریر کرتے ہوئے شمیم احمد شمیم نے کہا:

جناب والا! میں جناب صادق صاحب کو احمد آباد کے رُوح فرسا فسادات پر یہ قرارداد پیش کرنے پر مبارکباد دیتا ہوں۔ انہوں نے بڑی اخلاقی جرأت کا ثبوت دیا ہے لیکن ساتھ ہی میں یہ بھی عرض کردینا چاہتا ہوں کہ احمد آباد کے المناک سانحے پر صرف آنسو بہانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ یہ زخم اتنا گہرا ہے کہ اسے قراردادوں اور تقریروں سے بھرا نہیں جاسکتا، آج ضرورت اِس بات کی ہے کہ ہم سیاسی مصلحتوں اور قانونی نزاکتوں سے بلند ہوکر دوٹوک بات کریں اور ان سوالات کا جواب دینے کی کوشش کریں، کہ جو

احمد آباد کے خونین واقعات سے پیدا ہوئے ہیں! احمد آباد سے پہلے بھی ہمارے سینے میں کئی زخم موجود تھے۔ کلکتہ، رانچی، بھوپال اور جبل پور کے دئے ہوئے زخم ابھی پوری طرح مندمل بھی نہ ہونے پائے تھے، کہ احمد آباد کے شرمناک فسادات نے ایک بار پھر ہمارا سینہ چھلنی کر دیا۔ اور احمد آباد کا گھاؤ اتنا گہرا اور خطرناک ہے، کہ اسے بھرنے کے لئے ہمیں بہت کچھ کرنا ہوگا۔ بائیس سال سے ہم صرف اِس اُمید پر یہ زخم سہتے آئے تھے، کہ ہمارا ملک رفتہ رفتہ سیکولرازم اور مذہبی رواداری کے راستے پر گامزن ہو رہا ہے۔ اور ایک وقت ایسا آئے گا کہ فرقہ وارانہ منافرت کا ماحول ختم ہو جائے گا۔ گاندھی جی کے قاتل گوڈسے کو پھانسی کے تختے پر لٹکا کر ہم اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ہم نے ہندوستان کو راکھشسوں سے محفوظ کر دیا ہے، لیکن احمد آباد کے فسادات نے ہماری سبھی خوش فہمیاں دور کر دی ہیں۔ اور آج ہمیں محسوس ہو رہا ہے کہ ۲۲ سال بعد بھی ملک کی فضا بدلی نہیں ہے۔ بلکہ یہ دیکھ کر بے حد دُکھ ہو رہا ہے کہ فضا پہلے سے زیادہ زہریلی اور خطرناک بن گئی ہے۔ ہم گوڈسے کو پھانسی پر لٹکا کر مطمئن ہو گئے تھے، لیکن ہم یہ بھول گئے تھے کہ اس سرزمین پر سینکڑوں نہیں ہزاروں گوڈسے آج بھی اِس تاک میں لگے بیٹھے ہیں، کہ موقعہ ملتے ہی گاندھی کے سینے کو گولیوں سے چھلنی کر دیں۔ آج احمد آباد میں اایک بار پھر گاندھی جی کو قتل کر دیا گیا ہے اور اس سرزمین پر ہزاروں بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اُتارا جا رہا ہے۔ ....

اور ستم ظریفی ملاحظہ کیجئے، کہ یہ خون کی ہولی اس وقت کھیلی جا رہی ہے کہ

جب ہندوستان میں نہیں، ساری دنیا گاندھی جی کی سو سالہ سالگرہ منا رہی ہے اور گاندھی جی کی رُوح کو آج اسی شہر کے کوچہ و بازار میں سولی پر لٹکایا جا رہا ہے جہاں انہوں نے اہنسا اور محبت کا پیغام دیا تھا۔ ان گذر گاہوں کو خون سے دھویا گیا ہے کہ جن پر گاندھی جی کے نقشِ پا نظر آتے تھے۔ ہزاروں مردوں، عورتوں اور بچوں کو بے گناہی کے جرم میں تختہ دار پر لٹکایا گیا ہے اور دنیا حیران ہے کہ گاندھی کے دیش کو ہو کیا گیا ہے؟ لوگ کہتے ہیں کہ اتنے مسلمان مرے اور اتنے ہندو مرے، میں کہتا ہوں کہ نہ ہندو مرا اور نہ مسلمان، اس دیش میں انسانیت مر گئی ہے۔

احمد آباد کے فسادات نے کچھ اہم سوالات کو جنم دیا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ ہم سنجیدگی سے ان سوالات کا جواب دینے کی کوشش کریں۔

سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اگر بائیس برس کے بعد بھی ہندوستان میں مسلمان اپنے جان و مال کو محفوظ نہیں سمجھتا، تو اُس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ ہندوستان کو اپنا محبوب وطن تصور کرے، کیونکر ممکن ہو سکتا ہے؟

اگر اتنی بڑی فوج اور پولیس کے ہوتے ہوئے چند دنوں کے اندر اندر ہزاروں بے گناہ برسرِ بازار قتل کر دئے جاتے ہیں۔ تو حکومت اور انتظامیہ کی غیر جانبداری اور ایمانداری پر بھروسہ کیوں کر کیا جا سکتا ہے؟

اور ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ ان شرمناک واقعات کا اہل کشمیر پر ذہنی اور نفسیاتی طور پر کیا اثر ہو گا؟

احمد آباد میں جو کچھ ہوا ہے۔ اس نے ہمارے ضمیر ہی کو نہیں پورے

وجود کو جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے اور ایک بار پھر پاکستان کو یہ طعنہ دینے کا موقع ملے گا کہ یہی ہے وہ ہندوستان کہ جس کے ساتھ تم نے اپنا ناطہ جوڑا ہے؟ یہی ہے وہ دیش، کہ جہاں گاندھی جی اور جواہر لعل نے جنم لیا تھا؟ یہی ہے وہ حکومت کہ جس کے سیکولر کردار کی تم قسمیں کھایا کرتے ہو؟ میں نہیں جانتا کہ آپ ان چبھتے ہوئے طعنوں کو کیوں کر نظر انداز کر دیں گے۔ میرا سر تو شرم اور ندامت سے جھک گیا ہے۔

احمد آباد کے شرمناک فسادات کا سب سے شرمناک پہلو گجرات سرکار کی مجرمانہ غفلت اور سرد مہری ہے۔ پورے تین دن تک گجرات کی سرزمین بے گناہوں کے خون سے لت پت ہوتی رہی، لیکن گجرات کی کانگریسی سرکار ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ مرکزی وزیر داخلہ مسٹر چوان کو بھی اس وقت احمد آباد جانے کی فرصت ملی، کہ جب احمد آباد اور بڑوڈہ کے شہر خون میں ڈوب چکے تھے۔ میں پوچھتا ہوں کہ بے گناہوں کی زندگیاں بچانے سے زیادہ اہم کون سا کام تھا جو شری چوان کے فوراً احمد آباد پہنچنے میں مانع تھا۔ شریمتی اندرا گاندھی جی عین اس وقت امپھال میں لوگوں کو محبت اور آشتی کا درس دے رہی تھیں۔ کہ جب گجرات میں معصوم بچوں کو زندہ جلایا جا رہا تھا۔ کیا شریمتی گاندھی سب کام چھوڑ کر گجرات نہیں جا سکتی تھیں؟ مجھے ۱۹۴۷ء کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ دلی میں فسادات کی آگ بھڑک اُٹھی تھی۔ مسلمانوں پر پے در پے حملے ہو رہے تھے۔ دلی کے کچھ کانگریسی کارکن گاندھی جی کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ مسلمانوں کو سخت خطرہ ہے اور ان

کا جان و مال محفوظ نہیں۔ گاندھی جی نے پوچھا، کہ تم لوگ کیا کر رہے ہو، کارکنوں نے جواب دیا کہ ہم اپنی طرف سے مسلمانوں کو بچانے کی سخت کوشش کر رہے ہیں۔ گاندھی جی نے دریافت کیا، کہ یہ بتاؤ کہ مسلمانوں کو بچانے کی کوشش میں کتنے کانگریسی کارکن مارے گئے؟ کارکنوں نے جواب دیا کہ کوئی کانگریسی نہیں مرا۔

"تو پھر یہ کیوں کہتے ہو کہ ہم مسلمانوں کو بچانے کی سخت کوشش کر رہے ہیں؟ گاندھی جی نے اپنی مخصوص سادگی وپُر کاری سے دریافت کیا۔ یہی بات میں آج ہندوستان کے نیتاؤں سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں، کہ مسلمانوں کو بچاتے بچاتے پولیس اور فوج کے کتنے افسر مارے گئے؟ میں جاننا چاہتا ہوں کہ گجرات کے کتنے کانگریسی کارکن مسلمانوں کی حفاظت کرتے ہوئے زخمی ہو گئے! آج مرارجی ڈیسائی نے فسادات کے خلاف اپنی بیزاری کا اظہار کرنے کے لئے برت رکھا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ برت رکھنے سے کیا فائدہ؟ انہوں نے بے گناہوں کا خون کرنے والے قاتلوں کے ہاتھ سے گولی کیوں نہیں کھائی؟ وہ بم شریمتی اندرا گاندھی کے سر پر کیوں نہیں پھٹے، کہ جو بے گناہ اور معصوم عورتوں کو ہلاک کرنے کے لئے احمد آباد میں استعمال کئے گئے۔ جواہر لعل کی بیٹی اپنے باپ کی عزت بچانے کے لئے اس آگ میں خود کیوں نہیں کودی؟ صادق صاحب نے صرف ایک عدد بیان دینے پر ہی اکتفا کیوں کیا؟ وہ فسادات کی خبر سنتے ہی ہوائی جہاز میں سوار خود احمد آباد کیوں نہیں گئے؟ ان کی جماعت

کے کتنے کارکن احمد آباد کی آگ فرد کرنے کے لئے وہاں گئے؟ کیا وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ احمد آباد کے شرمناک فسادات کا براہِ راست اثر کشمیر پر پڑے گا۔ یہ سب اہم سوالات ہیں، ان کا جواب دینا ہی پڑے گا!

احمد آباد کے خونین ڈرامے میں بہت سے ان نوجوانوں اور بچوں کو بھی بے دردی کے ساتھ قتل کیا گیا کہ جو ملک کی تقسیم کے بعد پیدا ہوئے اور جن کا قصور صرف یہ تھا، کہ انہوں نے مسلمان گھروں میں جنم لیا تھا۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں ہوسکا، کہ انہیں کس جرم کی پاداش میں سزا دی جارہی ہے وہ صرف یہ جانتے تھے کہ ہندوستان اِن کا وطن اوران کے آبا داجداد کی سرزمین ہے اِنہیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ملک کی تقسیم کِس نے کی، کیوں کی؟ لیکن حیوانیت اور بربریت کے علمبرداروں نے ماؤں کی گود سے بچے چھین کر انہیں زندہ جلادیا۔ باپ کی نظروں تلے بیٹے کی گردن پر چھری پھیری اور معصوم عورتوں کو یہ بتائے بغیر، کہ انہیں کِس جرم کی سزادی جارہی ہے، آگ کے شعلوں میں دھکیل دیا اور غضب یہ کہ اُس غلام رسول قریشی کو بھی ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی کہ جس کی ساری زندگی مہاتما گاندھی کے قدموں تلے گذری ہے۔ اور جو سابرمتی آشرم میں گاندھی جی کی سب سے مقدس امانت کے طور پر رہ رہا تھا۔ غلام رسول قریشی پچاس سال تک گاندھی جی کے چرنوں میں رہنے کے باوجود اپنے مسلمان ہونے کا داغ نہ مٹا سکا۔ اور بلوائیوں نے صرف اس لئے اُسے مارنے کی کوشش کی، کہ اس کے نام سے بوئے مسلمانی آتی تھی، میں پوچھتا ہوں کہ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے

دیکھ کر ہندوستانی مسلمانوں کی نئی نسل اپنے آپ کو کس طرح ہندوستان کی تقدیر سے وابستہ کر سکتی ہے۔ مسلمانوں کو قومی زندگی کے دھارے سے وابستہ ہو جانے کا مشورہ دینے والوں کو ان حادثات پر بھی نظر رکھنا چاہئے۔

میں بڑا ترقی پسند ہوں، ہر قسم کے ذہنی تعصب اور تنگ نظری سے بالاتر ہوں۔ اس سال فروری کے مہینے میں، پاکستان گیا تھا اور میں نے وہاں ہندوستانی جمہوریت اور سیکولرازم کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے تھے۔ لیکن غلام رسول قریشی کا حشر دیکھ کر میرے ضمیر اور ذہن میں بڑا شدید تلاطم پیدا ہو گیا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ جس ملک میں، میں رہ رہا ہوں۔ وہاں میری ترقی پسندی اور وسیع النظری کو کوئی نہیں دیکھے گا۔ مجھے بار بار اِس بات کا احساس دلا جائے گا، کہ شمیم احمد شمیم کے نام سے مسلمان ہونے کی بو آتی ہے۔ میری ہی طرح بہت سے نوجوان یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ کہ ہندوستان ہمارے خوابوں کی جنت نہیں۔ میں نے اور میرے بہت سے دوستوں نے اپنے معاشرے، اپنے سماج، اپنی برادری، بلکہ ساری دنیا کو چھوڑ کر ہندوستان کے سیکولرازم اور اس کی جمہوریت پر اپنا اعتقاد ظاہر کیا تھا۔ احمد آباد کے واقعات نے اس اعتقاد کی جڑیں ہلا کر رکھ دی ہیں۔ جب ذہنوں میں یہ کشمکش اور روح میں یہ تلاطم پرورش پا رہا ہو، تو خالی خولی تقریروں اور قراردادوں سے زخموں پر مرہم نہیں رکھا جا سکتا ہمیں کُھل کر مجرم کی نشاندہی کرنا پڑے گی اور میری نگاہوں میں اس خونی ڈرامے کی تمام تر ذمہ داری گجرات کی کانگریسی سرکار پر ہے۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ

ریاستی حکومت اتنے وسیع اور مستحکم ذرائع کے باوجود فسادیوں کو فساد کی آگ پھیلانے سے روک نہیں سکتی اور جو حکومت اقلیتوں کے جان و مال کا تحفظ نہیں کر سکتی اسے اقتدار سے وابستہ رہنے کا حق حاصل نہیں۔

میری ملاقات پرسوں مشہور مصنف خشونت سنگھ سے ہوئی۔ مسٹر خشونت سنگھ اس دن سرینگر میں موجود تھے جب احمد آباد کے مظلوم مسلمانوں سے اظہار ہمدردی کرنے کے لئے وادی کشمیر میں مکمل ہڑتال کی گئی۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ انہیں اندیشہ تھا کہ سرینگر میں بھی وسیع پیمانے پر گڑبڑ ہوگی، کیونکہ جائز طور پر یہاں کے لوگوں کو سخت صدمہ پہنچا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ہڑتال پر امن رہی۔ اس کا سبب کیا ہے۔ میں نے خشونت سنگھ کو بتایا کہ سرینگر کے لوگ بھی آگ لگانا جانتے ہیں۔ پتھراؤ کرنا جانتے ہیں۔ اور سرکاری املاک کو نقصان پہنچانے کی ہمت رکھتے ہیں۔ لیکن وہ حد درجہ اِشتعال انگیزی کے باوجود مذہب کے نام پر کسی بے گناہ کا خون کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ہندوستان کے سیکولرازم پر ان کا وشواش تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ لیکن اپنی روایات اور اپنے ماضی پر ان کا اعتقاد ابھی تک قائم ہے اور اسی لئے سرینگر کی ہڑتال پر امن تھی۔ لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ اس بات کی فکر کیجئے، کہ کہیں گرد و پیش کے تلخ حقائق سے مجبور ہو کر مذہبی بھائی چارے، اتحاد اور یگانگت پر سے اہل کشمیر کا اعتقاد بھی ختم ہو جائے۔

احمد آباد میں صرف مریم ہی نہیں سیتا بھی قتل ہوئی ہے۔ صرف قرآن کی توہین نہیں ہوئی ہے۔ گیتا اور گرنتھ کی بھی توہین ہوئی ہے۔ مہاتما گاندھی

کی لاش کو احمد آباد کی سڑکوں پر گھسیٹا گیا ہے اور جس سرزمین پر انہوں نے اپنے بچپن اور جوانی کے بیش قیمت لمحے گذارے تھے۔ اس سرزمین کو بے گناہ بچوں کے خون اور پردہ نشین عورتوں کے آنسوؤں سے سیراب کر دیا گیا ہے۔ اس سانحے پر صرف مسلمانوں ہی کو نہیں، چالیس کروڑ ہندوستانیوں کو خون کے آنسو رونا چاہئے، یہ حادثہ نہیں قیامت ہے، ۱۹۴۷ء سے پہلے فرقہ وارانہ فسادات کی ذمہ داری اکثر انگریزوں پر رکھی جاتی تھی۔ آج بائیس سال بعد رونما ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔ میرے اپنے خیال میں اس کی ذمہ داری اس معاشرے پر ہے جس نے جن سنگھ جیسی فرقہ پرست جماعت اور بلراج مدھوک جیسے لوگوں کو عزت و توقیر بخشی ہے۔ جن لوگوں کی جگہ پھانسی کے تختوں پر ہونی چاہئے تھی۔ انہیں پارلیمنٹ کے مقدس ایوانوں میں جگہ دی جاتی ہے انہیں قومی یکجہتی کو فروغ دینے والی تنظیموں میں دعوت دی جاتی ہے۔ آج بلراج مدھوک نے گوڈسے کا روپ دھارا ہے اور احمد آباد کے فرقہ وارانہ فسادات سے صرف چند دن قبل بلراج مدھوک اور گرو گولوالکر کا احمد آباد میں موجود ہونا بہت ہی معنی خیز ہے۔ اور میں مطالبہ کرتا ہوں کہ ان پراسرار دوروں کی پوری حقیقت دنیا کے سامنے آ جانا چاہئے۔ آج ہندوستان دنیا کی نظروں میں ذلیل ہو گیا ہے اور اس کی عزت اور غیرت سڑکوں پر نیلام ہو رہی ہے۔ ہندوستان کے ہر شہری کو اس بے عزتی، ذلت اور رسوائی کا یہ کلنک مٹانے کی کوشش کرنا ہوگی۔

اقبالؔ نے ان کی بہیمت اور بربریت پرخون کے آنسو روتے ہوئے کہا تھا ؎

ابھی تک آدمی صید زبون شہر یاری ہے
قیامت ہے کہ انسان نوعِ انسان کا شکاری ہے

احمد آباد کی قیامت صغریٰ نے ہمارے شاعروں ،فن کاروں اور مصوروں کو مبہوت کر دیا ہے، ان کی روح گھائل اور ان کا احساس بُری طرح زخمی ہو گیا ہے۔ انہیں اپنے تاثرات کو اسلوب اور اظہار کا جامہ پہنانے میں ابھی کچھ وقت لگے گا، لیکن کشمیری زبان کے مشہور شاعر دینا ناتھ نادمؔ نے اپنا فوری ردِ عمل ایک سانیٹ کے روپ میں پیش کیا ہے۔ اجازت دیجئے کہ اسے آپ کے سامنے پیش کروں

قسم چُھم چانہ جبر وتک جلالک
قسم چُھم مارۂ مندہ موصم ارادک
قسم چُھم چانہ قوتک چانہِ وعدک
قسم چُھم تمہِ جسین عزمک خیالک
سُہ یس گاندھی جینی اسہِ برونٹھ کنہ تھود
سُہ یس نہرو سند یو ار مانو ے پول
سُہ یمی اِشفاق اللہ تیلہِ پھانسہ پیٹھ کھول
بھگت سنگھن پُنن زودتھ لگُن ہوو

قسم پُھم چانہِ آئینک قسم پُھم
قسم پُھوم زاٗژ روس دینگ قسم پُھم
ہمالاہ کے سفاشینگ قسم پُھم
بوچھوس گاٗی گاٗی گرژھان ، مندہ چھان ونہ کیاہ
بوکتھ ونہ ٹوٹھ ہندوستان ، ونہ کیاہ

☆

۱۱رنومبر ۱۹۷۸ء

بزدلانہ مصلحت پسندی

علی گڈھ کے فرقہ وارانہ فسادت کی ہولناکی، تباہی اور غارت گری کے متعلق کشمیر کی سیاسی قیادت نے جس سرد مہری، بے نیازی اور بے رحمی کا رویہ اختیار کیا ہے وہ قابل افسوس ہی نہیں۔ باعثِ شرم بھی ہے۔علی گڈھ کو جلتے ہوئے آج ایک مہینے سے زیادہ کا عرصہ گذر گیا ہے اور اس دوران وہاں کے مسلمانوں پر جو ظلم وستم اور قیامتیں ڈھادی گئیں اس پر ملک بھر کے حساس اور باضمیر عناصر نے نہ صرف احتجاج کیا بلکہ خون کے آنسو روئے ہیں۔ مقتدر صحافیوں، سیاسی جماعتوں کے سربراہوں اور دانشوروں نے اپنے رنج وغم اور درد جگر کا اظہار کرنے کے لئے مقالے اور مراسلے لکھے، اپنے سرکاری اعزازات واپس کیے۔ اور اکثریتی فرقے کی ناراضگی کی پرواہ کیے بغیر ڈنکے کی چوٹ مسلمانوں پر توڑے جانے والے مظالم کے خلاف آواز بلند کی۔ لیکن شیر کشمیر ہوں یا میر واعظ فاروق، مولانا مسعودی ہوں یا مرزا محمد افضل بیگ، ان میں سے کسی کو آج تک یہ توفیق نہیں ہوئی۔ کہ وہ علی گڈھ کے ان خونین واقعات پر احتجاج بلند کر کے مظلوموں کے زخموں پر مرہم

رکھتے۔ اور مرکزی حکومت کو اس کی ذمہ داریوں کا احساس دلانے کی کوشش کرتے۔ شیخ محمد عبداللہ جو ہر ہندوستانی وزیر کو اس کے جنم دن پر مبارک بادی کا تار دینا نہیں بھولتے، علی گڈھ کے معاملے میں اس طرح خاموش ہیں کہ جیسے وہاں دو مخالف ٹیمیں کرکٹ کھیلنے میں مصروف ہوں۔ میر واعظ مولوی فاروق، جنہیں اس ریاست میں جنتا پارٹی کا سب سے بڑا ہمدرد اور وکیل تصور کیا جاتا ہے۔ اور جو فلسطین میں مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کے خلاف احتجاج کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں۔ علی گڈھ کے بارے میں نہ معلوم کس مصلحت کے تحت خاموشی اختیار کئے ہوئے ہیں۔ یہی بات مولانا محمد سعید مسعودی پر بھی صادق آتی ہے کہ جو ریاست میں جنتا پارٹی کے صدر ہونے کے باوجود اس المناک سانحے پر اس طرح خاموش نظر آتے ہیں۔ کہ جیسے علی گڈھ کے واقعات حقیقت نہ ہوں، بلکہ جنتا پارٹی کے دشمنوں کی اُڑائی ہوئی بے بنیاد افواہیں ہوں۔ حیرت اس بات پر ہے کہ جنتا پارٹی کے تین معتبر اور سرکردہ رہنماؤں کی وہ تحقیقاتی رپورٹ بھی اب منظر عام پر آگئی ہے کہ جس میں انہوں نے علی گڈھ کے فسادات کی ذمہ داری آر ایس ایس پر عائد کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود میر واعظ مولوی محمد فاروق اور مولانا محمد سعید مسعودی، دونوں اس طرح خاموش اور بے نیاز ہیں۔ کہ جیسے ان کے زبان کھولنے سے اس کائنات کے توازن کے درہم برہم ہونے کا اندیشہ ہو۔ شیخ محمد عبداللہ کی زبان پر تو اسی دن تالے پڑ گئے کہ جب انہوں نے ہر قیمت پر اقتدار حاصل کرنے اور اسے قائم رکھنے کے لئے

مسز اندرا گاندھی کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ لیکن ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ میر واعظ فاروق اور مولانا مسعودی کی زبان کو کس مصلحت اور دور اندیشی نے ایسی زوردار لگام دی ہے کہ انہیں علی گڈھ کے بے گناہ مسلمانوں کا خون بھی اپنے لب ہلانے کی تحریک نہیں دیتا۔ ہمارا خیال تھا کہ مرزا محمد افضل بیگ اپنی حکومتی ذمہ داریوں سے فراغت پا کر اس اہم معاملے میں مسلمانان کشمیر کے جذبات کی ترجمانی کا فرض ادا کریں گے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی قیمت پر مرکزی حکومت کو ناراض کرنے کا خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہیں۔ نتیجہ یہ کہ ایک ایسے سانحے پر کہ جس کے متعلق ملک کے ہر ذی حس باشعور اور باضمیر انسان کو تشویش اور پریشانی لاحق ہے۔ اور جس پر بہت سے مقتدر اور سرکردہ غیر مسلموں نے دل کھول کر احتجاج کیا ہے، اس پر کشمیر کی سیاسی قیادت اس لئے خاموش ہے کہ وہ حقیر مفادات اور حقیر تر مصلحات کی خاطر دلی دربار یا اکثریتی فرقے کو ناراض نہیں کرنا چاہتی۔ ایسی قومی قیادت پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔

☆

۱۷ر مارچ ۱۹۷۷ء

یہ انتخاب نہیں انقلاب ہے...... چند تاثرات

پارلیمنٹ کے ہونے والے انتخابات کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ یہ جاننے کے لئے اب قیاس آرائیوں کی بجائے صرف دو چار دن انتظار کرنے کی ضرورت ہے لیکن قطع نظر اس کے کہ ووٹوں کی گنتی کے بعد کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ ملک کی موجودہ سیاسی صورت حال بجائے خود ایک ایسا دلچسپ اور فکر انگیز مطالعہ ہے کہ اسے دور سے دیکھنے یا پڑھنے کی بجائے اس میں شریک ہونا ایک مُفید تجربہ ثابت ہوسکتا ہے اور پچھلے آٹھ دس دن کے دوران بمبئی اور دہلی میں مجھے نہ صرف یہ انتخابی مہم کا ڈرامہ دیکھنے کا موقعہ ملا۔ بلکہ اس میں اپنے جوہر دکھانے کا بھی۔ میں بمبئی شہر کی اس نشست سے حزب مخالف کے اُمیدوار شری رام جیٹھ ملانی کی انتخابی مہم میں حصہ لینے کے لئے گیا تھا کہ جہاں سے مرکزی وزیر قانون شری ایچ آر گھوکھلے انتخاب لڑ رہے ہیں۔ مسٹر جیٹھ ملانی آل انڈیا بار کونسل کے منتخبہ صدر تھے اور انہوں نے ایمر جنسی کے دوران وکیلوں کے کئی اجتماعات میں ایمر جنسی اور آمریت کے خلاف ایسی زوردار تقریریں کیں کہ ان کے خلاف گرفتاری کے وارنٹ جاری کردیئے

گئے اور وہ گرفتاری سے بچنے کے لئے ہندوستان چھوڑ کر امریکہ پہنچ گئے، جہاں اُنہوں نے ہندوستان میں آمریت کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھی وہ یونیورسٹیوں میں لیکچر دیتے رہے اور انہوں نے اقوام متحدہ کے بنیادی حقوق والے کمیشن کے سامنے بھی ہندوستانی عوام کا مقدمہ پیش کیا ملک میں انتخابات کا اعلان ہوتے ہی رام جیٹھ ملانی ہندوستان آگئے اور انہوں نے ہوائی اڈے سے ہی یہ اعلان کر دیا کہ وزیر قانون مسٹر گھوکھلے کے خلاف انتخاب لڑوں گا، کیونکہ مسٹر جیٹھ ملانی کے خیال میں ہندوستانی جمہوریت کو مسز گاندھی سے زیادہ مسٹر گھوکھلے نے نا قابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ میں ذاتی طور پر مسٹر جیٹھ ملانی کی رائے سے متفق ہوں۔ اور میرا خیال ہے کہ اس ملک کے آئین کا ستیاناس کرنے میں جو رول مسٹر گھوکھلے نے وزیر قانون کی حیثیت سے کیا ہے وہ مسز گاندھی کے رول سے بھی زیادہ مجرمانہ اور بے رحمانہ ہے۔ رام جیٹھ ملانی سے میری دوستی کے علاوہ، میرے اس احساس نے مجھے گھوکھلے کے خلاف انتخابی مہم میں حصہ لینے کے لئے بمبئی جانے کی ترغیب دی اور ۵ مارچ کو میں بمبئی پہنچ گیا۔

باندرہ (بمبئی) کے ایک بہت بڑے میدان میں اُسی شام جنتا پارٹی نے ایک جلسے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جس میں مسز وجے لکشمی پنڈت تقریر کرنے والی تھیں۔ جلسے کی حاضری تیس ہزار کے قریب تھی اور مسز وجے لکشمی پنڈت نے بڑی سنجیدگی اور بڑے باوقار طریقے پر لوگوں کو حالیہ انتخابات کی اہمیت سمجھائی۔ مسز گاندھی کی پھوپھی ہونے کے ناطے مسز پنڈت کی حیثیت

بہت نازک ہے لیکن وہ جس متانت اور جس سلیقے سے اپنا فرض انجام دیتی ہیں۔اس کی تعریف کیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ وہ اپنی تقریر میں نہ مسز گاندھی کا نام لیتی ہیں اور نہ اُن کے صاحبزادے کا، لیکن اس کے باوجود موجودہ نظام پر اُن کا حملہ سب سے زیادہ بھرپور اور متاثر کن ہوتا ہے۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ مسز پنڈت بہت صاف اور شستہ اُردو بولتی ہیں اور بمبئی کے لوگ اُردو زبان کی نزاکتوں سے آشنا ہیں۔ مسز پنڈت کے بعد جب مجھے تقریر کرنے کے لئے کہا گیا، تو میں نے پہلے اپنا مختصر سا تعارف کروایا اور اس کے بعد ایمر جنسی، مسز گاندھی اور مسٹر گھوکھلے کے متعلق اپنے خیالات اور تاثرات بیان کیئے سامعین کے ردِعمل سے ظاہر ہو رہا تھا کہ میرا ایک ایک لفظ ان کے دلی خیالات کی ترجمانی کرر ہا تھا، در بقول رام جیٹھ ملانی ''میں نے مجمع لوٹ لیا'' ۔بمبئی کی فلمی زبان میں جس طرح فلم باکس آفس پر کامیاب ہوتی ہے اور اسی طرح بمبئی میں انتخابی مہم میں میری یہ پہلی تقریر ایسی ہٹ ثابت ہوئی، کہ اس کے بعد مجھے ہر روز چھ چھ سات سات جلسوں میں تقریریں کرنا پڑیں اور یہ سلسلہ شام آٹھ بجے سے شروع ہو کر رات کے ایک ڈیڑھ بجے تک جاری رہتا۔ میں نے اپنی تقریروں میں اس بات پر زیادہ زور دیا کہ موجودہ انتخابات میں کوئی فرقہ وارانہ سوال درپیش نہیں ہے اور ایمر جنسی کے اندھیرے نے فرقہ وارانہ منافرت اور مناقشات کو ختم کر دیا ہے۔ میں نے اس بات پر مسرت کا اظہار کیا کہ ملک سے جن سنگھ کا وجود ختم ہو گیا ہے اور گزشتہ تین برسوں میں پہلی بار ایک صحیح قسم کے سیکولرازم کی داغ بیل پڑ گئی

ہے میں نے اپنے سامعین کو اس بات کا بھی یقین دلایا کہ آمریت اور جمہوریت کی اس جنگ میں ریاست جموں وکشمیر کے عوام ملک کے عوام کے ساتھ ہیں۔ یوں تو میرا ارادہ صرف مسٹر گھوکھلے کے خلاف انتخابی مہم میں شرکت کرنا ہی تھا لیکن اس کے بعد ملحقہ انتخابی حلقوں کے اُمیدواروں نے بھی اصرار کیا، کہ میں ان کے جلسوں میں بھی تقریر کروں۔ اس لئے اپنے چھ روزہ قیام کے دوران مجھے مہاراشٹر کی مقبول ترین اور نامور سوشلسٹ لیڈر مسز مرنال گورے، جنتا پارٹی کے ایک اور اُمیدوار مسٹر راجدہ اور ریپبلکن پارٹی کے اُمیدوار مسٹر کامبلے کے جلسوں سے بھی خطاب کرنا پڑا۔ ان جلسوں میں کسی بھی جلسے میں حاضرین کی تعداد بیس بائیس ہزار سے کم نہ تھی۔ اور انتخابی جوش وخروش کا یہ عالم تھا کہ لوگ رات کے ۹ بجے سے لے کر ۲ بجے تک اس اطمینان سے تقریریں سننے کے لئے بیٹھے رہتے کہ جیسے ان کی زندگی کا واحد مقصد تقریریں سننا ہو بمبئ کے لوگوں کو اچھی تقریر سننے کا زبردست شوق ہے اس کا علم مجھے پہلے سے بھی تھا اور آج سے چھ سال قبل بمبئ کے لوگوں سے میری شناسائی اردو کنونشن میں میری تقریر ہی سے ہوئی تھی۔ لیکن اب کی بار انتخابی بخار نے اس شوق کو جنوں کی حد تک پہنچا دیا اور اس جوش اور سرگرمی کی وجہ سے شہر بھر میں میری وہ پذیرائی ہوئی، کہ فلمی ستارے بھی رشک کرتے ہوں گے۔ میرے سٹیج پر نمودار ہوتے ہی حاضرین تالیاں بجا بجا کر یہ مطالبہ کرتے کہ ہم مسٹر شمیم کی تقریر سننا چاہتے ہیں اور اس ذوق و شوق نے دو بار میرے لئے بہت ہی نازک صورت حال پیدا کر دی۔ ایک

بارولے مارے کے ایک جلسہ عام میں ملک کے ایک بہت بڑے نیتا تقریر کررہے تھے، کہ میں سٹیج پر پہنچ گیا۔ اس کے بعد لوگوں نے بڑے نیتا کی تقریر سننے کی بجائے اس خاکسار کی تقریر سننے پر اصرار کیا اور مجھے بڑی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔ یہی حادثہ مشہور جن سنگھی لیڈر سبھر امنیم سوامی کے ساتھ بھی پیش آیا۔ ایک جلسے میں کسی صاحب نے ایک معمولی سی گھڑی پیش کردی کہ شمیم صاحب اس کا نیلام کریں۔ گھڑی کی قیمت تین چار سو روپے سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن جب میں نے اس کا نیلام کیا تو پندرہ منٹ سے بھی کم عرصے میں یہ گھڑی پانچ ہزار روپے میں بک گئی۔ اسی طرح جگہ جگہ لوگوں نے نوٹوں کے ہار پہنائے اور یہ ساری رقم جنتا پارٹی کے الیکشن فنڈ میں جمع ہوگئی۔ انتخابی مہم کے دوران جنتا پارٹی کے لئے عوامی جوش وخروش کا یہ بے مثال مظاہرہ دیکھ کر یہ پیشین گوئی کرنا مشکل نہیں کہ اگلے ہفتے کے آخر تک ملک سے حکمران کانگریس کی حکومت کا خاتمہ ہو کر آزاد ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار ایک نئی حکومت قائم ہوگی۔ لیکن حکمران جماعت کی بے اصولی، انتخابی طریق کار کے متعدد نقائص، سرکاری مشینری کے بے جا استعمال اور موجودہ حکمران ٹولے کے گھناونے کردار کے پیش نظر یہ سب کچھ دیکھ کر قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے بمبئی سے روانہ ہونے سے پہلے یہ بات سننے میں آئی۔ کہ مسٹر گھوکھلے نے شہر میں اپنی ناکامی کے اندیشے سے گھبرا کر اب جھگی جھونپڑیوں میں رہنے والے غریبوں کے ووٹ خریدنے کا تہیہ کیا ہوا ہے۔ اور اس مقصد کے لئے ووٹ ڈالنے سے ایک دن پہلے لاکھوں روپے

خرچ کرنے کا پروگرام مرتب کیا گیا ہے۔ اسی طرح ان غریبوں کو جنہیں شہر سے اُکھاڑ کر دور پھینک دیا گیا ہے۔ اب طرح طرح کا لالچ دے کر ان کے ووٹ حاصل کرنے کی ترغیبیں کی جا رہی ہیں۔ غرض حکمران طبقہ اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے جو بھی حربہ استعمال کرسکتا ہے استعمال کر رہا ہے اور کرے گا۔ اس صورت حال کے پیش نظر جنتا پارٹی کی غیر معمولی مقبولیت کے باوجود ان کا پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل کرنا، کم از کم مجھے مخدوش نظر آتا ہے لیکن اس حقیقت کو تاریخ کے صفحات سے ہٹانا ممکن نہیں یہ کہ یہ محض انتخاب نہیں ایک انقلاب ہے۔ اور اس انقلاب کی آمد کو کچھ دیر کے لئے ٹالا جاسکتا ہے۔ ہمیشہ کے لئے روکا نہیں جاسکتا۔ مسز گاندھی کے اقتدار کی بنیادیں ہل گئی ہیں۔ اور اب انہیں دوبارہ استحکام حاصل کرنے کی ہوئی اُمید نہیں۔ ہونے والے انتخابات کا یہی ایک فائدہ ہوگا۔

☆

۶ مئی ۱۹۷۷ء

ماسٹر پلان عُرف خطرناک سازش

مارشل پلان، کامراج پلان، سامراج پلان اور پنجسالہ پلان، ان کھیل تماشوں سے تو آپ واقف ہی ہوں گے اور اگر نہیں ہیں، تو مجھے آپ کی معصومیت سے زیادہ آپ کی جہالت پر رحم آئے گا۔ لیکن میرے رحم آنے اور ترس کھانے سے چونکہ آپ کی جہالت دور نہیں ہوگی اس لئے آپ کے جنرل نالیج میں اضافہ کرنے کے لئے مختصراً ان پلانوں کا تعارف کرنا پڑے گا۔

مارشل پلان :-

یہ پلان امریکہ کے لال بجھکڑوں نے دلی میں غریبی کا خاتمہ اور کمیونزم کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کیا تھا۔ اس پر عمل درآمد شروع ہوتے ہی ساری دنیا میں غربت اور کمیونزم کا غلبہ بڑھتا گیا۔

کامراج پلان :-

اس پلان کو پنڈت جواہر لال نہرو کا چوہے دان بھی کہتے ہیں۔ پنڈت جی نے ۱۹۶۳ء میں بڑے بڑے چوہے پکڑنے کے لئے یہ پلان

تیار کیا تھا جو اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ شری مرار جی ڈیسائی، ایس، کے پاٹل، بخشی غلام محمد، بیجو پٹنا یک یہ سب بڑے بڑے چوہے اسی چوہے دان میں گرفتار ہو گئے

سامراج پلان :-

یہ ایک مستقل منصوبے کا نام ہے جسے ہندوستان کی ہر حکومت بے دریغ استعمال کرتی ہے جب بھی سرکار کی کوئی پالیسی ناکام رہتی ہے اس ناکامی کو سامراج پلان سے منسوب کر کے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حکومت اپنی ناقابلیت اور نااہلیت سے عوام کی زندگی دوبھر کر دے تو اس کی ذمہ داری بھی سامراج پلان پر ڈال دی جاتی ہے۔ لوگ احتجاج کریں۔ مخالف جماعتیں مظاہرے کریں۔ بھوک سے نڈھال ہونے والے خودکشی کریں، حکومت کی نظروں میں یہ سب سامراجی چالیں ہیں اور سامراج پلان کا ایک حصہ اب موسم کی خرابی اور فصلوں کی تباہی کو بھی اس پلان کا نتیجہ قرار دیا جانے لگا ہے۔

پنجسالہ پلان :-

یہ آزادی کے بعد ملکی عوام کے ساتھ سب سے بڑے فراڈ کا عنوان ہے اس کا مقصد ملک سے غربت، بیکاری اور بیروزگاری دُور کرنا بتایا جاتا ہے لیکن جب سے یہ پلان شروع کیے گئے ہیں غریبوں کی غربت، امیروں کی امیری، ضروریات زندگی کی قیمتوں، بے کاروں کی تعداد، بیروزگاروں کی مشکلات، ہر چیز میں سوگنا اضافہ ہوا ہے چار پنجسالہ پلان

پورے ہوگئے ہیں۔ پانچواں پانچسالہ پلان تیار کرنے میں ابھی تک پانچ سال گذر گئے ہیں۔

پلان:-

اُردو اور کشمیری دونوں زبانوں میں سازش کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور سرکار آئے دن عوام کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتی ہے اس لئے گزشتہ کئی برسوں میں پنجسالہ پلانوں کے علاوہ بھی کئی پلان مرتب کئے گئے ہیں۔ ان پلان کا اضافہ سب سے پُر فریب اور خطرناک منصوبہ یا سازش قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کا مقصد کھلونے دے کر سلانا اور سبز باغ دکھا کر بیوقوف بنانا ہے۔ کلکتہ بمبئی اور دہلی کے بعد اب سرینگر کے ''احمد بازی گروں'' نے بھی سرینگر شہر کے لئے ایک عددِ ماسٹر پلان تیار کیا ہوا ہے اور اس ماسٹر پلان کا مقصد سرینگر شہر کا ''میک اپ'' کر کے اس گٹ اپ کو بہتر بنانا، بتایا جاتا ہے۔ ہمیں چونکہ ماسٹر پلانوں کی تاریخ، تعریف، تشریح اور تنقید میں ماسٹری حاصل ہے اس لئے ہم نے اس ''ماسٹر سازش'' کا بغور مطالعہ کیا ہے اور اس مطالعے کی روشنی میں ہم اس اخبار کے ذریعے اپنی تنقید اور تجویز ''بازی گرانِ قوم'' کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

نام:-

سب سے پہلا اعتراض مجھے اس پلان عرف سازش کے نام پر ہے۔ ماسٹر پلان کے نام سے عام لوگوں کو یہ دھوکہ ہوسکتا ہے کہ یہ شہر سرینگر کے ماسٹروں کے لئے یا ان کے خلاف کوئی پلان ہے حالانکہ اس کا نہ ماسٹروں

کے ساتھ کوئی تعلق ہے اور نہ مستریوں کے ساتھ! اگر ''ماسٹر پلان'' میں کوئی معنوی خصوصیت تھی تو پھر اس کا نام ماسٹر پلان کی جگہ ہیڈ ماسٹر پلان ہونا چاہئے تھا کیونکہ ہیڈ ماسٹر عام طور پر اسکولوں میں کوئی کام نہیں کرتے اور اس ماسٹر پلان کے تحت بھی اس شہر میں کوئی کام ہونے والا نہیں۔

ولدیت:-

ماسٹر پلان کے اصلی والد محترم (بروزن اصلی ملزم) مفتی محمد سعید (وزیر تعمیرات) کا شجرۂ نسب میں کوئی ذکر نہیں۔ ان کی جگہ کچھ ''پیرزادوں'' اور ''سیدزادوں'' کا نام درج ہے۔ شاہدوں میں ایک ویدا صاحب (جو وید سے ویدا ہو گئے ہیں) ایک لہروال صاحب (جو کچھ عرصہ قبل لہریں گنا کرتے تھے) ایک پانپوری صاحب (جن کی سکونت جواہر نگر میں ہے لیکن نسبت پانپوری ہے) ایک در صاحب (جو دربدر پھرتے ہیں) ایک کاشتکاری صاحب (جو ساری زمین چھن جانے کے بعد بھی کاشتکاری کہلانے پر مصر ہیں) اور ایک عدد شمس الدین (جو ڈپٹی زیادہ اور کمشنر کم دکھائی دیتے ہیں) کے اسمائے گرامی بھی شامل ہیں۔ اصل میں یہ سارا فتنہ مفتی صاحب کا کھڑا کیا ہوا ہے اور پیرزادہ صاحب اور سید (عبدالواحد) صاحب نے تعویذوں کے زور سے اسے ''ماسٹر فتنہ'' بنا کر پیش کیا ہے۔ اقبآل نے کہا ہے ؎

میں جانتا ہوں انجام اس کا
جس معرکے کا ملّا ہو غازی

اب آپ اندازہ کیجئے کہ جس معرکے یا فتنے میں ایک ملّا کی بجائے

پورے ہو گئے ہیں۔ پانچواں پانچسالہ پلان تیار کرنے میں ابھی تک پانچ سال گذر گئے ہیں۔

پلان:-

اُردو اور کشمیری دونوں زبانوں میں سازش کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور سرکار آئے دن عوام کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتی ہے اس لئے گزشتہ کئی برسوں میں پنجسالہ پلانوں کے علاوہ بھی کئی پلان مرتب کئے گئے ہیں۔ ان پلان کا اضافہ سب سے پُر فریب اور خطرناک منصوبہ یا سازش قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کا مقصد کھلونے دے کر سلانا اور سبز باغ دکھا کر بیوقوف بنانا ہے۔ کلکتہ بمبئی اور دہلی کے بعد اب سرینگر کے ''احمد بازی گروں'' نے بھی سرینگر شہر کے لئے ایک عددِ ماسٹر پلان تیار کیا ہوا ہے اور اس ماسٹر پلان کا مقصد سرینگر شہر کا ''میک اپ'' کر کے اس گٹ اپ کو بہتر بنانا، بتایا جاتا ہے۔ ہمیں چونکہ ماسٹر پلانوں کی تاریخ، تعریف، تشریح اور تنقید میں ماسٹری حاصل ہے اس لئے ہم نے اس ''ماسٹر سازش'' کا بغور مطالعہ کیا ہے اور اس مطالعے کی روشنی میں ہم اس اخبار کے ذریعے اپنی تنقید اور تجویز ''بازی گرانِ قوم'' کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

نام:-

سب سے پہلا اعتراض مجھے اس پلان عرف سازش کے نام پر ہے۔ ماسٹر پلان کے نام سے عام لوگوں کو یہ دھوکہ ہو سکتا ہے کہ یہ شہر سرینگر کے ماسٹروں کے لئے یا ان کے خلاف کوئی پلان ہے حالانکہ اس کا نہ ماسٹروں

کے ساتھ کوئی تعلق ہے اور نہ مستریوں کے ساتھ! اگر ''ماسٹر پلان'' میں کوئی معنوی خصوصیت تھی تو پھر اس کا نام ماسٹر پلان کی جگہ ہیڈ ماسٹر پلان ہونا چاہئے تھا کیونکہ ہیڈ ماسٹر عام طور پر اسکولوں میں کوئی کام نہیں کرتے اور اس ماسٹر پلان کے تحت بھی اس شہر میں کوئی کام ہونے والا نہیں۔

ولدیت:۔

ماسٹر پلان کے اصلی والد محترم (بروزن اصلی ملزم) مفتی محمد سعید (وزیر تعمیرات) کا شجرۂ نسب میں کوئی ذکر نہیں۔ ان کی جگہ کچھ ''پیرزادوں'' اور ''سیدزادوں'' کا نام درج ہے۔ شاہدوں میں ایک ویدا صاحب (جو وید سے ویدا ہو گئے ہیں) ایک لہر وال صاحب (جو کچھ عرصہ قبل لہریں گنا کرتے تھے) ایک پانپوری صاحب (جن کی سکونت جواہر نگر میں ہے لیکن نسبت پانپوری ہے) ایک در صاحب (جو دربدر پھرتے ہیں) ایک کاشتکاری صاحب (جو ساری زمین چھن جانے کے بعد بھی کاشتکاری کہلانے پر مصر ہیں) اور ایک عدد شمس الدین (جو ڈپٹی زیادہ اور کمشنر کم دکھائی دیتے ہیں) کے اسمائے گرامی بھی شامل ہیں۔ اصل میں یہ سارا فتنہ مفتی صاحب کا کھڑا کیا ہوا ہے اور پیرزادہ صاحب اور سید (عبدالواحد) صاحب نے تعویذوں کے زور سے اسے ''ماسٹر فتنہ'' بنا کر پیش کیا ہے۔ اقبالؔ نے کہا ہے ۔

میں جانتا ہوں انجام اس کا
جس معرکے کا ملاّ ہو غازی

اب آپ اندازہ کیجئے کہ جس معرکے یا فتنے میں ایک ملاّ کی بجائے

تین ملاّ (ایک مفتی، ایک پیر، ایک سید) غازی بننے کے لیئے بے چین ہوں اس کا انجام کیا ہوگا؟

تاریخ پیدائش:-

ماسٹر پلان پر کہیں تاریخ پیدائش درج نہیں ہے (ناجائز بچوں کی پیدائش کا کون حساب کتاب رکھتا ہے!) ماسٹر پلان چونکہ پیدائش کے ساتھ مر بھی جاتا ہے اس لیئے اس پلان کی تاریخ پیدائش اور یوم وفات ایک ہی ہوگا۔

جغرافیہ:-

ماسٹر پلان کے لیئے اس شہر کا جغرافیہ متعین تیار کرنا ضروری ہوتا ہے کہ جس کے حساب سے یہ پلان تیار کیا گیا ہے۔ سرینگر شہر کے خلاف اس گہری سازش (ماسٹر پلان) کو منظّم کرتے وقت جو جغرافیہ پیش نظر رکھا گیا ہے بہت پُرانا اور کئی لحاظ سے زائد المیعاد ہو چکا ہے۔ نیا جغرافیہ کچھ اس طرح ہے۔ سرینگر ''دامن کوہ'' (جہاں وزیر اعلیٰ رہتے ہیں) سے شروع ہو کر ہوائی اڈے پر (جہاں سے وزیر اعلیٰ اور ان کے دوسرے ساتھی دہلی کے لیئے روانہ ہوتے ہیں) ختم ہوتا ہے۔ ''دامن کوہ'' کے شمال میں گپکار روڈ اور امر سنگھ کلب کا علاقہ ہے جہاں اکثر وزراء امراء اور ان کے اقرباء کی کوٹھیاں ہیں اس کے علاوہ سرینگر کلب اور سرکاری مہمان خانے بھی اس علاقے کی زینت ہیں۔ جنوب میں ''نیا سیکرٹریٹ'' (جہاں وزیر اعلیٰ کا دفتر اور دوسرے سرکاری دفاتر قائم ہیں) مشرق کی طرف جھیل ڈل اور مغرب میں ''ٹیلی

ویژن ٹاور'' ''اصلی شہر'' کا حدود اربعہ متعین کرتے ہیں۔ باقی شہر ایک عظیم تاریخی یادگار ہے جسے جوں کا توں رکھنے سے اس شہر کی تاریخی اہمیت اور عظمت برقرار رکھی جاسکتی ہے۔ ماسٹر پلان میں تاریخی شہر کی اس تاریخی اہمیت کو ختم کرنے کی بھی سازش کی گئی ہے جس کے خلاف مولانا محمد فاروق، غلام محمد سالار اور عبدالرحیم وازہ سب کو متحد ہو جانا چاہئے۔

فائدے:-

ماسٹر پلان، کا سب سے زیادہ فائدہ ان ''سازشی عناصر کو ہوتا ہے کہ جو یہ پلان مرتب کرتے ہیں۔ اس پلان پر عملدر آمد تو کبھی نہیں ہوتا ہے۔ لیکن اس پر بحث و مباحثہ بڑے زور کا ہوتا ہے اور ''منصوبہ بازوں'' کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے شہر کو ''شہر کی سڑکوں کو، پانی کی سپلائی کو، آمدورفت کے ذرائع کو، کھیل کود کے میدان کو، بہتر بنانے کا جب بھی اور جس جانب سے بھی مطالبہ ہوگا۔ ان تمام مطالبات کا جوب ''ماسٹر پلان'' ہوگا۔ حکومت اپنی ہر کوتاہی، لاپرواہی، بے نیازی اور بے راہ روی کے لئے ''ماسٹر پلان'' کا جواز پیش کرے گی اور شہر کے بیوقوف لوگ اس ''سبز باغ'' کی ہوس میں، سختی اور تلخی برداشت کرلیں گے۔ دس پندرہ برس میں جب ''ماسٹر پلان'' کا جادو سر سے اُتر جائے گا۔ اور اس کی طبع شدہ ایک کاپی بھی کہیں دستیاب نہ ہو سکے گی، تو اِس وقت ایک نیا ماسٹر پلان شائع کیا جائے گا۔ جو نزاکت اور طباعت کے اعتبار سے موجودہ پلان سے بھی زیادہ خوبصورت ہوگا۔ پھر کئی برس تک اس پر مباحثہ ہوتا رہے گا اور اس طرح صدیوں تک یہ چکر چلتا

رہے گا۔ ماسٹر پلان راجہ محمد یعقوب خان درد کا ایجاد کردہ نسخہ ''سٹامک گارڈ''
ہے جو ہر مرض کی دوا ہے اور جس کے استعمال سے مریض کو کم اور راجہ
صاحب کو زیادہ فائدہ پہنچتا ہے ہے ماسٹر پلان سے شہریوں کی بجائے
حکومت کو فائدہ ہوگا۔

نقصانات:-

ماسٹر پلان سے یوں تو شہریوں کو بہت سے نقصانات اُٹھانا پڑیں گے
۔لیکن سب سے بڑا نقصان یہ ہوگا کہ ماسٹر پلان کے نام پر حکومت کو بہت سی
زیادتیاں، ناانصافیاں اور من مانیاں کرنے کا موقع ملے گا۔اب تک کسی نئے
مکان یا بیت الخلاء کی تعمیر کے لئے اجازت نامہ حاصل کرنے میں صرف ۴۰۰
روپے یا پانچ سو روپے خرچ ہوتا تھا اب ماسٹر پلان کے نام پر یہ رقم ایک ہزار
سے بھی زیادہ بڑھ جائے گی۔شہر کے ظاہری رنگ وروپ میں تو کوئی اضافہ
نہیں ہوگا لیکن رشوت ستانی اور بدعنوانی کے امکانات یقیناً بڑھ جائینگے۔

☆

۷ مئی ۱۹۷۷ء

ماسٹر پلان عرف خطرناک سازش

(۲)

تجاویز:-

مفتیوں، پیرزادوں اور سیدزادوں کا تیار کردہ ماسٹر پلان جان بوجھ کر اتنا بھاری بھرکم بنا دیا گیا ہے کہ آئندہ بیس بائیس برسوں میں اس پر عمل درآمد ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں اس میں قسم قسم کے کاغذی بیل بوٹے سجا دیئے گئے ہیں اور پڑھنے والا اس کی رعنائیوں میں کچھ اس طرح کھو جاتا ہے کہ وہ اسے ماسٹر پلان کی بجائے الف لیلیٰ کی داستان سمجھنے لگتا ہے۔ اس میں جگہ جگہ اسکول، ہسپتال، ڈاک خانے، ٹیلی فون ایکسچینج، فائر سٹیشن، لائبریریاں، ریڈنگ روم، میوزیم، سنیما ہال، ٹاؤن ہال قائم ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم سرینگر کی بجائے یوروپ کے کسی مہذب اور ترقی یافتہ شہر کی سیر کر رہے ہیں۔ شاعرانہ تخیل کی یہ اُڑان قابل تعریف تو ہے لیکن قابل عمل ہے یا نہیں؟ اس کے بارے میں دو رائیں ممکن ہیں۔ سب سے پہلی یہ بات ہے کہ اتنا ڈھیر ہمارا روپیہ کہاں سے آئے گا؟ (پنجسالہ پلان کے دوران ۲۴ کروڑ روپے کے خرچ کا اندازہ ہے) مان لیجئے کہ روپے مل بھی گیا تو اس بات کی

کہاں ضمانت ہے کہ یہ روپیہ واقعی ماسٹر پلان ہی پر خرچ ہوگا؟ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ اس روپے کا 70% حصہ ''ماسٹروں'' پر خرچ ہوگا اور باقی ۳۰ فیصد پلان پر۔ اس طرح ماسٹر صاحبان کی تو چاندی ہوگی اور پلان کی مٹی پلید ہوجائے گی! بہرکیف سارا معاملہ چونکہ خیالی پلاؤ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا، اس لئے پلاؤ میں مزید خیالی مصالحہ ڈالنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اسی نیت اور ارادے سے میں ماسٹر پلان کے ماسٹر صاحبان کی خدمت میں کچھ نیک اور نادر تجویزیں پیش کرتا ہوں۔ ان تجاویز کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ کم خرچ بھی ہیں اور بالانشین بھی اور ان پر فوری طور عمل درآمد بھی کیا جاسکتا ہے ان پر عمل کرنے سے کسی کا بُرا نہیں ہوگا لیکن بہتوں کا بھلا ہوگا۔

تجویز نمبر (ا):-

سب سے پہلے ہمیں سرینگر کی بہت سے عمارات اور سڑکوں کا نام بدلنا چاہئے تاکہ شہر میں فوری تبدیلی کا احساس نمایاں ہوجائے۔ مثلاً نیو سیکرٹریٹ کو ہیرا پھیری بھون، ریڈیو اسٹیشن کو بہتان بھون، مجاہد منزل کو مجاہد میوزیم، بڈشاہ ہوٹل کو بڑھے شاہ کا ہوٹل، شالی اسٹور کو گالی اسٹور، صدر ہسپتال کو ذبح خانہ، سنٹرل جیل کو گاؤ خانہ، میونسپلٹی کو شامت اعمال اور ٹورسٹ سنٹر کو انٹی ٹورسٹ کا نام دیا جانا چاہئے اسی طرح پرتاپ پارک کو قاسم پارک، نہرو پارک کو اندرا پارک اور گاندھی پارک کو بنگلہ دیش پارک کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔ سڑکوں میں مولانا آزاد روڑ کو شیر کشمیر روڑ، نالہ مار کے اوپر مجوزہ سڑک کو شاہراہ فاروق، گپکار روڑ کو گزرگاہ مفتی اور ریذیڈنسی روڑ کو کوچہ

عاشقان کا نام دیا جاسکتا ہے اس تجویز پر عمل کرنے میں ڈیڑھ سو روپے سے زیادہ رقم خرچ نہیں ہوگی، یہ رقم سائن بورڈ لکھوانے پر صرف ہوگی۔

تجویز نمبر (۲):-

شہر میں پارکوں کی بہت کمی ہے اس لئے کم از کم چار نئے پارکوں کے لئے زمین مہیا کی جانی چاہئے۔ ان میں سے ایک پارک شہر کے بیکاروں کے لئے مخصوص کیا جائے اور اسے ''بیکار پارک'' کہا جائے۔ اس پارک میں فلمی موسیقی تاش، کیرم بورڈ اور دوسری انڈور گیمز کے علاوہ جاسوسی ناولوں اور سراغرسانی سے متعلق جرائد پر مشتمل ایک لائبریری بھی ہونا چاہئے۔ یہاں بے کاروں کو بے کاری کے خلاف جلسے کرنے کی آزادی لیکن جلوس نکالنے پر پابندی عائد ہوگی، اس پارک سے بالآخر اس قوم کی نئی لیڈر شپ اُبھرے گی۔

تجویز نمبر (۳):-

ایک اور پارک شہر کے جواریوں کے لئے مخصوص ہونا چاہئے تاکہ شہر کے اطراف واکناف میں پھیلے ہوئے جواریوں کو ایک مرکز پر جمع کر کے انہیں اپنا شغل جاری رکھنے کے لئے ہر ممکن سہولت بہم کی جائے اس پارک میں جوا کھیلنے والوں سے باقاعدہ طور ٹیکس وصول کیا جانا چاہئے اس سے شہر کی آمد میں اضافہ اور کوتوال شہر کی آمدن میں نمایاں کمی واقع ہو جائے گی۔ سرینگر اور امر سنگھ کلب کے جواریوں کو اس پارک میں جوا کھیلنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اس پارک کے قریب ہی ایک عبادت گاہ مسجد، مندر،

چرچ یا گوردوارہ بھی تعمیر کی جانی چاہیئے تاکہ ہارے ہوئے جواری اپنے گناہوں سے توبہ کرنے کے لئے عبادت گاہ کا رُخ کریں۔

تجویز نمبر (۴):۔

ماسٹر پلان کے تحت کئی بازار اور سپر بازار تعمیر کرنے کی تجویز ہے۔ لیکن میری تجویز ہے کہ چور بازار کے نام ایک الگ مارکیٹ تعمیر کیا جائے اور اس میں صرف وہ اشیاء بھیجی جائیں کہ جو شہر کے دوسرے بازاروں اور سپر بازاروں میں دستیاب نہ ہوں۔ اس مارکیٹ میں صرف ان لوگوں کو دھندا کرنے کی اجازت دی جائے جو ویسے بھی چور بازاری عرف بلیک مارکیٹ میں مصروف ہیں۔ اس مارکیٹ کی تعمیر سے یہ فائدہ ہوگا کہ ضروریات زندگی کی ہر چیز جو اس وقت نایاب ہے، فوراً ہی مہنگے داموں دستیاب ہونا شروع ہوگی اور چور بازار کے سوداگر، جو اس وقت اپنا مال چوری چھپے بیچ کر سو گنا منافع کماتے ہیں پچاس گنا منافع پر قناعت کر کے لوگوں کو مال دستیاب کریں گے۔ اس بازار میں چونکہ زبردست بھیڑ لگنے کا امکان ہے اس لئے اس میں داخل ہونے والوں پر دس روپے فی کس ٹیکس لگنا چاہیئے۔ اس سے یقیناً کافی آمدنی ہوگی۔ چور بازار کا مکمل انتظام، چور بازاریوں کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے اور اس میں حکومت کو قطعی کوئی دخل نہیں دینا چاہیئے۔

تجویز نمبر (۵):۔

چور بازار میں ایک حصہ شہر اور بیرون شہر کے سمگلروں کے لئے مخصوص ہونا چاہیئے جہاں یہ لوگ باہر سے سمگل کیا ہوا مال بیچ سکیں۔ عام لوگوں کو یہ

مال کھلے طور خرید نے کی اجازت ہونی چاہیئے اور اس پر باقاعدہ ٹیکس لگنا چاہیئے ۔ اس سے ریاست کی آمدنی میں خاصہ اضافہ ہوگا۔ کیونکہ لوگوں کو اسمگل کی ہوا مال خرید نے کی سخت Craze ہے یہ کاروبار حج سے آنے والے اور حج پر جانے والے بزرگوں کی تحویل میں دینا چاہیئے۔

تجویز نمبر (٦) :-

ریذیڈنسی روڑ عرف کوچۂ عاشقان پر کافی ہاوس کے طرز پر ایک عدد چنڈو خانہ تعمیر کرنا چاہیئے جہاں غیر ملکی ہپی اور مقامی چرسی ایک ساتھ بیٹھ کر چرس پیا کریں اس قسم کے چھوٹے چھوٹے چنڈو خانے شہر کے اندرونی حصوں میں قائم کیئے جانے چاہئیں تا کہ شہر کے بے چارے غریب چرسیوں کو معمولی داموں پر چرس بھی ملے اور چرسیوں کی عالمی برادری سے اختلاط کا موقع بھی نصیب ہو۔ اس سے بین الاقوامی مفاہمت اور بھائی چارے کا احساس بڑھے گا۔ یہ چنڈو خانے چلانے کے لئے حکومت کو باضابطہ طور پر چرس کا کاروبار اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہیئے۔

تجویز نمبر (٧) :-

شہر میں سابق وزیروں ، بیکار سیاستدانوں اور ریٹائرڈ آفیسروں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور یہ لوگ صبح سے شام تک شاہراوں پر آوارہ گردی کرتے نظر آتے ہیں۔ میرے خیال میں پرتاپ پارک عرف قاسم پارک کے دوسروں پر دو نئے کلب تعمیر کیئے جانے چاہئیں ۔ ایک سابق وزیروں اور بے کار سیاستدانوں کے لئے ، دوسرا ریٹائرڈ آفیسروں اور

عمر رسیدہ تاجروں کے لئے، سابق وزیروں کے کلب میں ان کے عہدِ وزارت سے متعلق ان کی تصویریں، مقامی اخبارات علم نجوم کی کتابیں اور تاش کی کئی گڈیاں مہیا کی جانی چاہئیں۔ اس کلب کو جوئیں مارنے کی دوائی کا خاص کوٹا مہیا کیا جانا چاہئے کیونکہ عام طور پر وزیروں کے وزارت سے سبکدوش یا محروم ہونے کے بعد انہیں جوئیں پڑ جاتی ہیں اور ان کے مارنے کا باقاعدہ انتظام ہونا چاہئے۔ مکھیاں مارنے کے لئے کسی خصوصی اہتمام کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ سابق وزیر مکھیاں ہی مارتے رہتے ہیں۔ بے کار سیاستدانوں کے دماغی توازن کی جانچ پڑتال کے لئے دماغی امراض کا ماہر ایک ڈاکٹر بھی اس کلب سے وابستہ کیا جانا چاہئے۔ ریٹائرڈ آفیسروں اور عمر رسیدہ تاجروں کے کلب میں آٹھ سال پرانے میگزین اخبارات اور شکار سے متعلق کتابیں مہیا کی جانی چاہئیں۔ اس کے علاوہ نسوار، تمباکو، پان اور پاندان کا بھی انتظام رہنا چاہئے اس کلب میں ایک نہیں کئی ڈاکٹر ہر وقت موجود رہنے چاہئیں۔

تجویز نمبر (۸):۔

غیبت کلب کے نام سے شہر کے وسط میں ایک خالص زنانہ کلب قائم ہونا چاہئے۔ جہاں شہر بھر کی عورتیں جمع ہو کر دنیا بھر کی بُرائی کیا کریں، اس کلب میں عورتیں اپنے شوہروں کی غیبت کرنے کے علاوہ اپنی پڑوسنوں کے متعلق افواہیں پھیلایا کریں گی۔ اس کلب کے باہر ہر وقت زنانہ پولیس کی ایک بٹالین موجود رہنا چاہئے جو ہر وقت کلب میں داخل ہو کر امن قائم

کرنے کی مجاز ہو۔

تجویز نمبر (۹):-

شہر میں ایک عدد میوزیم پہلے ہی موجود ہے ماسٹر پلان کے تحت اس کو مزید وسعت دینے کی تجویز ہے لیکن میرے خیال میں ایک اور نیا میوزیم تعمیر کیا جانا چاہئے اور اس میوزیم میں ایسے لوگ رکھنے چاہئیں کہ جو زمانہ قدیم کی یادگار ہوں، یا کسی اعتبار سے نادر روزگار، شہر میں ایسے سیاستدانوں اور مہدہ خانوں کی کمی نہیں ہے کہ جن کی اصلی جگہ میوزیم ہے لیکن جو شہر کی سڑکوں پر یوں دندناتے پھرتے ہیں کہ جیسے ان ہی کے وجود سے تصویر کائنات اور بزم سیاست کی رونق ہے اس قسم کے لوگوں کو جو اپنی تاریخی اہمیت کے اعتبار سے اہم ہیں۔ مگر افادیت کے لحاظ سے بے کار ہیں، کو اس میوزیم میں محفوظ رکھنا چاہئے اور ان کی مناسب دیکھ بھال کی جانی چاہئے۔

تجویز نمبر (۱۰):-

شہر کی واٹر سپلائی کو بہتر بنانے کے وعدے پچھلے پچیس برسوں میں، ایک نہیں تو پچاس بار کئے گئے ہیں۔ ماسٹر پلان میں ایک بار پھر یہ وعدہ دہرایا گیا ہے، لیکن مجھے اس کا اعتبار نہیں۔ فی الحال میری تجویز یہ ہے کم از کم دودھ میں ملانے کے لئے گوالوں کو صاف پانی مہیا کیا جانا چاہیے۔ اور اس مقصد کے لئے ہر شیر فروش سے اس کی ضروریات طلب کر کے اسے مناسب مقدار میں صاف پانی مہیا کیا جانا چاہیے۔ تا کہ صاف دودھ میں گندا پانی ملا

کر دودھ کی کوالٹی مجروح نہ ہونے پائے۔

تجویز نمبر (۱۱):-

شہر میں ٹریفک کے بڑھتے ہوئے دباؤ اور ٹریفک پولیس میں بڑھتی ہوئی رشوت ستانی اور نااہلیت کے پیش نظر اس بات کا اندیشہ ہے کہ سرینگر ایک چھوٹا موٹا کلکتہ نہ بن جائے۔ اس خطرے کو ٹالنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ٹریفک کا انتظام، ٹانگہ بانوں کے سپرد کر دیا جائے، جو ریذیڈنسی روڑ مولانا آزاد روڑ اور نیو سیکرٹریٹ کو جانے والی سڑکوں پر موٹروں، بسوں اور اسکوٹروں کے چلنے پر پابندی عائد کر کے صرف ٹانگے اور بیل گاڑیاں چلانے کی اجازت دیں گے۔ شالی اسٹور کی طرف آنے اور جانے والی سڑک دن میں آٹھ گھنٹے کسی نہ کسی بہانے بند ہی رہتی ہے اس کو مکمل طور بند کیا جائے تو بہتوں کا بھلا ہوگا۔

ماسٹر پلان، کے متعلق میری تعریف، تنقید اور تجاویز، حرف آخر، کی نہیں، حرفِ آغاز، کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس موضوع پر قارئین ''آئینہ'' کو بھی دعوت فکر دی جاتی ہے۔ اور انشاء اللہ اگلی اشاعتوں میں یہ سلسلہ کسی نہ کسی صورت میں جاری رہے گا۔

☆

۱۶ ستمبر ۱۹۷۷ء

چراغ بیگ کی طرف سے عید مبارک

ان روزہ داروں کو کہ :-

جنہوں نے رمضان المبارک کے پورے تیس روزے رکھے۔ ان زاہدوں کو کہ جنہوں نے ماہ مبارک میں ہر اس چیز سے پرہیز کیا کہ جس سے روزوں کا تقدس مجروح ہونے کا احتمال تھا۔ ان عابدوں کو کہ جنہوں نے روزے کے تمام لوازمات، نماز، تراویح اور زکوٰۃ کے حقوق بھی ادا کیے۔ ان مومنوں کو کہ جنہوں نے صرف روزے ہی نہیں رکھے، اپنے نفس کو صبر اور ضبط کی وہ تربیت دی کہ، جو روزوں کا اصل مقصد ہے۔ ان دینداروں کو کہ جو پورے تیس دن وقت سحر نہ صرف خود بیدار ہوتے رہے۔ بلکہ دوسروں کو بیدار کرنے کا فرض بھی انجام دیتے رہے۔ ان واعظوں کو کہ جو ماہ مبارک کے دوران مسلمانوں کو روزے کی فضیلت اور اسلام کی عظمت کا درس دیتے رہے۔ ان ایمانداروں کو کہ جنہوں نے اس بابرکت مہینے میں اپنے ایمان کو ہر ممکن طریقے سے سلامت رکھنے کی کوشش کی۔ ان تہجد گذاروں اور سحر خانوں کو کہ جو راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر سوتوں کو جگانے کا فریضہ انجام دیتے رہے۔

ان بے روزوں کو کہ :-

جو ثواب طاعت و زہد جان کر بھی روزے کا ثواب حاصل کرنے کی سعادت سے محروم رہے۔ جو ماہِ رمضان میں چھُپ چھُپ کر اپنے شکم کی آگ بجھاتے رہے جو خود بے روزہ ہونے کے باوجود دوسروں کو بے روزہ ہونے کا طعنہ دیتے رہے۔ جو گھر میں روزداروں کے ساتھ سحری کھا کر دن کو قہوہ خانوں میں افطار کرتے رہے۔ جو خوفِ خدا سے بے نیاز، کھلے بندوں ماہِ رمضان میں بھی ناؤ نوش میں مصروف رہے۔ جو روزوں کا اہتمام تو کرتے رہے۔ لیکن جنہیں ایک بار بھی نماز ادا کرنے کی توفیق عطا نہ ہوئی جو روزوں کو فیشن سمجھ کر پابندی سے روزہ دار رہے۔ لیکن جو ان کی اہمیت، معنویت اور فضیلت کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ جو ماہ رمضان میں بھی اپنی بدمستیوں، خرمستیوں اور بداعتدالیوں سے باز نہیں آئے۔

ان دکانداروں اور تاجروں کو کہ :-

جنہوں نے ٹورسٹ سیزن کی طرح ماہِ رمضان کا بھی استحصال کیا۔ جنہوں نے اس متبرک مہینے میں بھی اشیاء خوردنی میں ملاوٹ کا دھندا ترک نہیں کیا۔ جنہوں نے پورے تیس دن میں سے ایک دن بھی بلیک مارکٹنگ، منافع خواری اور چور بازاری سے پرہیز نہیں کیا۔ جنہوں نے عامتہ المسلمین کی مجبوریوں سے فائدہ اُٹھا کر ہر چیز کے کئی گنا دام وصول کیئے۔ جنہوں نے چھپے ہوئے سرکاری نرخناموں کو لفافے بنا کر ان میں مہنگے داموں والی اشیاء

بیچیں۔

ان سبزی فروشوں کو کہ :-

جن کے لئے یوں تو ہر دن روزِ عید ہوتا ہے، لیکن جنہوں نے عید کے نام پر سال بھر کے لئے کما لیا ہے۔ جن کو نہ خوف خدا ہے اور نہ خوف حکومت اور جو ہر قسم کی اخلاقیات سے مبرا ہیں۔ جن کو خدا نے ضمیر سے محروم اور زمین سے مالا مال کر دیا ہے۔ اور جو ضمیر کو زمین کی طرح بیچنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے۔ جن کے لئے سرکار کا مقرر کیا ہوا نرخنامہ کسی بازاری حکیم کا نسخہ ہوتا ہے کہ جس پر عمل کرنا نہ کرنا مریض کی مرضی پر منحصر ہے۔ جن کی دکانوں پر کل اور پرسوں وہ ازدھام نظر آ رہا تھا۔ کہ جیسے وہاں آلو اور بیگن نہیں، آبِ حیات بک رہا ہو۔

اُن سرکاری افسروں کو کہ :-

جو آج کے دن بھی اپنے گھروں کی بجائے اپنے سے بڑے افسروں اور وزیروں کی کوٹھیوں کا طواف کرتے نظر آئیں گے جو اپنے ماتحت ملازموں سے کیک، پیسٹریوں اور میوے کے تحفے قبول کر کے انہیں اپنے سے بڑے افسروں کے ہاں پہنچا دیں گے جو آج کے دن بھی رشوت لینے اور دینے کے کارنیک میں مصروف رہیں گے۔ جو آج ٹھیکیداروں اور درمیانہ داروں سے نذرانے وصول کرنے میں کچھ زیادہ ہی مستعدی اور سرگرمی دکھائیں گے۔

ان سیاستدانوں کو کہ :-

جو رمضان میں ایک روزہ رکھے بغیر بھی سب سے زیادہ مبارک بادیاں وصول کریں گے۔ جو عید کے مقدس اور مذہبی تہوار کو بھی اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنے سے دریغ نہیں کریں گے جو آج کے دن بھی باہمی نفرت اور عداوت کے بیج بولنے میں مصروف رہیں گے۔ جو آج دن بھر سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنانے میں سرگرم عمل نظر آئیں گے۔

ان ممبران اسمبلی کو کہ :-

جو حالیہ انتخابات میں رائے شماری کے نام پر کامیاب ہو کر اب الحاق کو مضبوط بنانے کے نیک کام میں لگے ہوئے ہیں۔ جو آج دن بیچارے رائے دہندگان سے نذرانے وصول کر کے انہیں نئے وعدوں کی شراب پلاتے رہیں گے۔ جو انتخابات میں اپنی غیر متوقع اور غیر ضروری کامیابی پر اپنی حیرت اور مسرت کا اظہار کر کے عید منائیں گے۔

☆

۱۱ستمبر ۱۹۷۵ء

کشمیرا کارڈ

کہاں ہے، کس طرف ہے اور کدھر ہے

جن لوگوں نے ۴ جولائی کو اُس اُمید پر نیشنل کانفرنس کے کھمبوں کے حق میں اپنے ووٹ کا استعمال کیا تھا کہ ایسا کرنے سے نیشنل کانفرنس کے قائدین ۱۹۴۷ء کی غلطی کی اصلاح کرسکیں گے اور وہ ہندوستان کے تسلط سے آزاد ہو کر اپنے خوابوں کی کھوئی ہوئی جنت دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ انہیں ۸ ستمبر کو ریاستی قانون سازیہ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے ریاست کے گورنر ایل کے جھا کی تقریر سن کر صرف مایوسی ہی نہیں ہوئی بلکہ سخت غصہ بھی آیا ہوگا۔ گورنر جھا نے جب اپنے افتتاحی خطبے میں یہ دعویٰ کیا۔ کہ حالیہ انتخابات میں نیشنل کانفرنس کی فتح نے اس فیصلے پر مہر تصدیق ثبت کردی، کہ جو اس جماعت کے رہنماؤں نے ۱۹۴۷ء میں کشمیر کی قسمت کو ہندوستان کے ساتھ وابستہ کر کے کیا تھا۔ تو عام لوگوں کی بات ہی نہیں، ایوان میں بیٹھے ہوئے نیشنل کانفرنسی ممبران اسمبلی کو بھی اس حیرت انگیز انکشاف پر حیرت ہوئی ہوگی۔ انہیں انتخابی مہم کے دوران اپنی وہ تقریریں یاد آئی ہوں گی۔ کہ جن میں انہوں نے رائے دہند

گان کو یقین دلایا تھا۔ کہ اسمبلی کے یہ انتخابات اس رائے شماری کا نعم البدل ہیں۔ کہ جس کی رو سے ریاستی عوام کو اپنی تقدیر اور اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ انہیں بھولے بھالے عوام کو دی گئی وہ یقین دہانیاں بھی یاد آئی ہوں گی کہ جن کے مطابق ریاستی اسمبلی میں ٹھوس اکثریت حاصل کرنے اور حکومت بنانے کے فوراً بعد نیشنل کانفرنس کے قائدین ۱۹۵۳ء کی آئینی پوریشن بحال کرنے کا اعلان کر دیں گے۔ اور اس طرح ریاست کی اندرونی خود مختاری نہیں، بلکہ مکمل خود مختاری کا تیس سالہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوگا۔ لیکن گورنر جہانے اپنے خطبے میں جس طرح نیشنل کانفرنس کی کامیابی کو ہند کے ساتھ الحاق کے فیصلے کی تصدیق قرار دیا اس نے صرف ۴۶ ممبران اسمبلی (دو ممبران اسمبلی کو سب کچھ پہلے سے معلوم تھا) کو ہی نہیں، ان چھ لاکھ رائے دہند گان کو بھی درطۂ حیرت میں ڈال دیا ہوگا۔ کہ جنہوں نے خوش فہمیوں اور غلط فہمیوں کے اندھیرے اُجالے میں نیشنل کانفرنس کو ووٹ دئے تھے۔ گورنر کا ایڈریس، چونکہ حکومت اور حکمران جماعت کا تیار کردہ ہوتا ہے۔ اور گورنر کا کام صرف اسے بہ آواز بلند پڑھنا ہوتا ہے۔ اس لئے یہ کہنے کی بھی گنجائش نہیں، کہ جو کچھ گورنر بہادر نے کہا ہے۔ وہ ان کی اپنی رائے ہے گورنر کے خطبے کو ریاستی حکومت کی سب سے متعبر اور مستند دستاویز اور آواز سمجھنا چاہیے، اور اس اعتبار سے یہ دستاویز نیشنل کانفرنسی رائے دھند گان کے لئے کتنی ہی مایوس کن اور پریشان کن کیوں نہ ہو۔ ریاستی عوام کی بھاری اکثریت کے لئے بے حد حوصلہ افزا اور خوش کن ہے۔

گورنر بہادر نے اپنے اس تاریخی خطبے میں اسمبلی کے حالیہ انتخابات سے ایک اور دلچسپ نتیجہ بھی برآمد کیا ہے۔ ان کی رائے میں نیشنل کانفرنس کی عظیم الیشان کامیابی نے مفاہمت اور مصالحت کے اس معاہدے کی بھی تصدیق اور تائید کی ہے۔ کہ جو فروری ۱۹۷۵ء میں شیخ محمد عبداللہ اور سابق وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے درمیان طے پایا تھا۔ اس طرح گورنر موصوف کے خیال میں اسمبلی کے حالیہ انتخابات مشہور دوائی امرت دھارا کی طرح ہر درد کی دوا اور ہر دُکھ کا علاج ہیں۔ اور ان کی دانست میں نیشنل کانفرنس کی غیر معمولی کامیابی نے ہر مشکوک مسئلے کو حتمی طور پر حل کر دیا ہے۔ حالیہ انتخاب کے نتائج نے الحاق کے فیصلے پر مہر تصدیق ثبت کی یا نہیں مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کیونکہ میری رائے میں اس فیصلے کی بار بار تصدیق کی نہ ضرورت ہے اور نہ کوئی جواز...... لیکن انتخابی نتائج کو کشمیرا کارڈ کی تائید اور تصدیق قرار دینا ایک ایسی غلط بیانی ہے۔ کہ جس پر احتجاج نہ کرنا سیاسی بددیانتی کے مترادف ہوگا۔ اس بات کا جائزہ لینے سے پہلے کہ حالیہ انتخابات کا اکارڈ سے کوئی تعلق تھا یا نہیں۔ یہ دیکھنا فائدہ مند ہوگا کہ یہ اکارڈ تھا کیا، اور اس کی اصلیت کیا ہے؟ اس سلسلے میں ان دستاویزات کا مطالعہ کافی دلچسپ ثابت ہوگا کہ جو اکارڈ کی بنیاد قرار دئے جاسکتے ہیں۔

۲۳ راگست کو شیخ محمد عبداللہ نے وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے نمائندے مسٹر جی پارتھا سارتھی، کے نام ایک خط میں اپنا موقف ان الفاظ میں بیان کیا۔

''مجھے اُمید ہے کہ آپ سے کل اور پرسوں کی بات چیت کے دوران میں نے اچھی طرح یہ بات واضح کردی ہے کہ میں صرف اُس بنیاد پر اقتدار سنبھالنے کے لئے تیار ہوں گا کہ جو ۸ راگست ۱۹۵۳ء کو قائم تھی۔ جہاں تک آئین کی دفعات اور ۹ راگست کے بعد سے ریاست پر لاگو کئے جانے والے قوانین کا تعلق ہے ان پر نئی اسمبلی کے قائم ہونے تک غور وخوض ملتوی کیا جائے گا۔''

اس خط کے الفاظ اور تیور بتا رہے ہیں کہ شیخ صاحب، اس وقت تک کسی بھی قیمت پر وزارت اعلیٰ کی باگ دوڑ سنبھالنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ کہ جب تک ۸ راگست ۱۹۵۳ء والی پوزیشن بحال نہ کردی جائے۔ لیکن مسز گاندھی مسٹر پارتھا سارتھی اور سید میر قاسم سبھی جانتے تھے، کہ یہ محض دھمکی ہے، اور اس کا مقصد کچھ مزید مراعات حاصل کرنا ہے اور بس، ان کا اندازہ صحیح تھا اور ۱۱ رفروری ۱۹۷۵ء کو شیخ صاحب نے اقتدار سنبھالنے پر اپنی آمادگی ظاہر کرتے ہوئے مسز گاندھی کو جو خط لکھا۔ اس میں وہ واضح طور اپنے اس موقف سے دستبردار ہوگئے۔ ''جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ میری رائے یہ ہے کہ جموں اور کشمیر اور مرکز کے درمیان آئینی رشتہ وہی ہونا چاہئے کہ جو ۱۹۵۳ء میں تھا۔ لیکن پھر بھی مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ بیگ صاحب اور مسٹر پارتھا سارتھی کے متفقہ نتائج ''سیاسی سطح اور مرکز اور ریاست کے درمیان میرے تعاون اور اشتراک کی ایک اچھی بنیاد بن سکتے ہیں'' دوسرے الفاظ میں شیخ صاحب یہ کہتے ہیں، کہ اگر چہ میری رائے میں ۱۹۵۳ء کی پوزیشن بحال ہونا چاہیے۔ لیکن آپ چونکہ اس پر رضامند نہیں

ہوتیں۔ اس لئے میں اس پر اصرار کئے بغیر اقتدار سنبھالنے اور سیاسی سطح پر آپ کو تعاون دینے کے لئے تیار ہوں۔ اور اس کے بعد اس غیر مشروط تعاون کا مقصد ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

''ہندوستان کے ساتھ کشمیر کا الحاق کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ میرا پختہ یقین ہے کہ جموں و کشمیر کا مستقبل ہندوستان کے ساتھ وابستہ ہے۔ کیونکہ دونوں کے آئیڈیلز مشترکہ ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ اس بات کو محسوس کریں گی۔ کہ سیاسی اور سرکاری سطح پر میرا آپ سے تعاون کرنے پر آمادہ ہونے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ریاستی حکومت عوام کی فلاح و بہبود کے لئے ایسے اقدامات کرنے کے اہل ہو جائے کہ جو میرا منتہائے مقصود ہے۔''

شیخ صاحب کے اس واضح بیان کے بعد ان کا بہترین سے بہترین وکیل بھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہ ریاست کی خود مختاری یا اندرونی خود مختاری بحال کرنے کے لئے اقتدار کی ذمہ داریاں سنبھالنے پر آمادہ ہو گئے۔ انہوں نے بیگ صاحب اور مسٹر پارتھا سارتھی کے جن متفقہ نتائج کا حوالہ دے کر انہیں اپنے تعاون کی اچھی بنیاد قرار دیا ہے۔ ان میں بھی ۱۹۵۳ء کی پوزیشن بحال کئے جانے کا کوئی تذکرہ نہیں۔ ان متفقہ نتائج میں ۱۹۵۳ء کے بعد سے لاگو کئے گئے بعض قوانین پر نظر ثانی کے مطالبے کو اس حد تک تسلیم کیا گیا ہے کہ سوشل ویلفیر تمدنی معاملات، سوشل سیکورٹی، پرسنل لاء اور ان سے متعلقہ قوانین پر ریاستی حکومت نظر ثانی کرسکتی ہے۔ لیکن انہیں تبدیل یا ان میں ترمیم کرنے کی غرض سے نہیں، بلکہ صدر جمہوریہ کے سامنے اس بات کی

سفارش کرنے کے لیئے کہ ان میں سے کسی قانون میں ترمیم کی ضرورت ہے یا کونسا منسوخ کیا جانا چاہئے۔ اس کے بعد آئین کی دفعہ ۲۴۵ کے تحت کاروائی ہوسکتی ہے۔ اور صدر جمہوریہ اس کاروائی پر ہمدردانہ غور کریں گے۔

یہ ہے لب لباب، اس مشترکہ فیصلے کا کہ جو شیخ صاحب کے الفاظ میں ان کے تعاون کی ایک اچھی بنیاد بن سکتی ہے۔ اور اس بنیاد پر اقتدار سنبھالنے کے بعد قانونی اور آئینی اعتبار سے شیخ صاحب اپنے اس موقف پر عملاً دستبردار ہو گئے۔ کہ جس کا ذکر انہوں نے ۲۳ راگست ۱۹۷۴ء کو شری پارتھا سارتھی کے نام اپنے خط میں کیا ہے۔

بیگ صاحب اور مسٹر پارتھا سارتھی کے ''متفقہ نتائج'' سے زیادہ اہم اور معنی خیز وہ نکتے ہیں۔ کہ جن پر فریقین کے درمیان کوئی اتفاق یا سمجھوتہ نہ ہوسکا۔ ان کی تفصیلات بیگ صاحب کے اس خط سے ظاہر ہوتی ہیں کہ جو انہوں نے ۱۳ رنومبر ۱۹۷۴ء کو شری پارتھا سارتھی کے نام لکھا

ڈیر شری پارتھا سارتھی!

میں نے آج اس کاغذ پر دستخط کیئے ہیں کہ جس میں وہ نکات درج ہیں کہ جن پر ہم متفق ہیں، آپ کو یاد ہوگا کہ مختلف مسائل پر آپ سے اپنی بات چیت کے دوران میں نے مندرجہ ذیل معاملات پر بھی کچھ تجویزیں پیش کیں۔

☆ بنیادی حقوق سے متعلق دفعات ریاست کے آئین میں شامل کرنا۔

☆ قانون سازیہ کے انتخابات پر مرکزی الیکشن کمیشن کی نگرانی، ہدایات اور کنٹرول کو ختم کرنا۔

☆ آئین ہند کی دفعہ ۳۵۶ میں ایسی ترمیم کہ جس سے اس کے تحت جاری ہونے والے احکامات کے لئے ریاست کی منظوری ضروری ہو یا اسی قسم کا کوئی تحفظ، طویل بحث ومباحثے کے بعد آپ میری ان تجاویز سے متفق نہیں ہوئے۔ براہ کرام اس خط کی رسید بھجوا دیجئے۔

آپ کا مخلص

مرزا محمد افضل بیگ

ان خطوط کے مطالعے سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی ہے کہ اندرا شیخ مفاہمت کا واحد مقصد اور مدعا یہ تھا کہ شیخ صاحب کانگریس کے تعاون اور اشتراک سے غیر مشروط طور ریاست کے وزیر اعلیٰ بن جائیں۔ اس سلسلے میں تمام غلط فہمیاں اور شکوک دفع کرنے کے لئے مسز اندرا گاندھی کا وہ خط کافی اہم ہے کہ جو انہوں نے شیخ صاحب کے ۱۱ر فروری ۱۹۷۵ء کے خط کے جواب میں ۱۲ر فروری ۱۹۷۵ء کو لکھا۔ مسز گاندھی نے لکھا۔

''میں ریاست جموں وکشمیر کی نسبت مرکز اور ریاست کے تعلقات کے بارے میں آپ کے خیالات سے واقف ہوں، میں آپ کو پہلے ہی سمجھا چکی ہوں، کہ گھڑی کو پیچھے کی طرف گھمانا ممکن نہیں ہے۔ اور ہمیں موجودہ حقائق کو تسلیم کر لینا چاہئے۔''

صاف ظاہر ہے کہ مسز گاندھی نے بغیر کسی ابہام کے مرکز اور ریاست کے درمیان شیخ صاحب کے نظریات کو رد کر کے انہیں موجودہ حقائق کو تسلیم کرنے کا مشورہ دیا ہے اس کے بعد بھی اگر کسی کو یہ غلط فہمی ہے کہ شیخ اندرا

مفاہمت کا کانگریس لیجسلیچر پارٹی کے تعاون سے وزیر اعلیٰ بننے کے علاوہ بھی کوئی مقصد تھا تو وہ یا تو بیوقوف ہے یا دوسروں کو بیوقوف بنانے پر تُلا ہوا ہے۔

یہ تو رہی کشمیر اکارڈ کی اصلیت سرکاری اہتمام سے شائع شدہ دستاویزات کی روشنی میں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حالیہ انتخابات کے نتائج سے اس اکارڈ کی تصدیق کیوں کر ہوئی۔

۲۶ مارچ کو کانگریس لیجسلیچر پارٹی نے مسز اندرا گاندھی کی حمایت بلکہ ہدایت پر شیخ صاحب کو اپنا دیا ہوا تعاون واپس لے لیا اور پردیش کانگریس کے صدر مفتی محمد سعید نے دہلی میں جاری کردہ ایک بیان میں باقاعدہ طور اپنے آپ کو وزیر اعلیٰ اور شری گردھاری لال ڈوگرہ کو نائب وزیر اعلیٰ نامزد کر دیا۔ اس طرح اس اعلان کے ساتھ ہی وہ اکارڈ بھی ختم ہو گیا۔ کہ جس کا ذکر گورنر بہادر نے اپنے خطبے میں کیا ہے اور جس کی دہائی آج یعنی پیر غیاث الدین، موتی لال مصری اور نور محمد جیسے ہارے ہوئے جواری دے رہے ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ فریقین کے درمیان خط و کتابت پر مبنی اس اکارڈ کو اب ریاستی میوزیم کے شعبہ دستاویزات کے سپرد کر دینا چاہیے۔ تا کہ اس سے عام لوگوں میں کسی قسم کا انتشار یا اضطرار نہ پھیلے، میرا خیال ہے کہ اسمبلی کے آزادانہ انتخابات میں شیخ صاحب اور ان کی جماعت نیشنل کانفرنس کی غیر معمولی کامیابی، مرکز اور ریاست کے درمیان باہمی تعلقات کی زیادہ معتبر اور مستند بنیاد بن سکتی ہے۔ چہ جائیکہ ایک ایسی دستاویز کا بار بار ذکر کیا جائے کہ جسے اقتدار کی کنجی کے سوا کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا۔

۲۴/اگست ۱۹۷۷ء

یادوں کی برات خواتین کہاں ہیں؟

فروری ۱۹۷۵ء میں جب شیخ صاحب نے ریاست کی عنان اقتدار سنبھالی، تو انہوں نے دو ایک ماہ تک اپنی کابینہ کو صرف مرزا محمد افضل بیگ، ٹھاکر دیوی داس اور صونم نربو تک ہی محدود رکھا۔ ان کا کہنا تھا کہ میں نے ریاست کے طول وعرض میں بڑی تلاش کی، لیکن مجھے ان تین شخص کے سوا کوئی چوتھا ایماندار آدمی نظر نہیں آیا، کہ جسے میں کابینہ میں شامل کرتا۔ چند ماہ بعد شیخ صاحب نے خواجہ غلام محمد شاہ، شری منگت رام، سردار رنگیل سنگھ، حکیم حبیب اللہ اور غلام نبی کوچک کو وزارت میں شامل کر کے یہ ثابت کر دیا کہ انسان اگر خلوص نیت سے اپنی تلاش جاری رکھے، تو اسے پتھروں میں بھی ہیرے مل سکتے ہیں یہ ان ہی دنوں کی بات ہے کہ شیخ صاحب وزارتی کونسل میں عورتوں کو نمائندگی دینے کے لئے بھی بہت کوشاں تھے۔ اور کسی خاتون منسٹر کی تلاش میں تھے، ایک دو بار اس سلسلے میں میری رائے بھی دریافت کی، تو میں نے صرف اس خیال سے کہ محترمہ زینب بیگم قانون ساز اسمبلی کی ممبر ہونے کے علاوہ کانگریس کی سرکردہ رکن بھی ہیں ان کا نام تجویز کیا۔ شیخ

صاحب نے اس تجویز سے اس لئے اتفاق نہیں کیا، کہ وہ اس منصب کے لئے کسی تعلیم یافتہ خاتون کی تلاش کر رہے تھے۔ اور زینب بیگم کی تعلیم محض واجبی ہے۔ مس محمودہ احمد صلی کا نام زیر غور آیا۔ تو ان کی تندی و تیزی کے پیش نظر، اس پر بھی اتفاق نہ ہوسکا۔ آخر میں کہیں سے مس طاہرہ شہمیری کا نام ٹپک پڑا، اور فیصلہ ہوا کہ انہیں تعلیم کا وزیر مملکت بنا دیا جائے گا۔ مجھے اس انتخاب اور اس فیصلے پر کچھ تعجب سا ہوا لیکن زینب بیگم اور محمودہ جی کے بعد میرے ذہن میں بھی مس شہمیری کے علاوہ کوئی اور نام نہیں آرہا تھا۔ اس لئے میں نے اسے محض زینب بیگم کی بدبختی اور مس شہمیری کی خوش نصیبی سمجھ کر گوارا کرلیا۔ مجھے اس فیصلے کی اطلاع دہلی میں ہی مل گئی تھی۔ اور یہ اس دن کی بات ہے کہ جس شام شیخ صاحب دہلی سے روانہ ہوکر دوسرے دن جموں میں کابینہ میں توسیع کا اعلان کرنے والے تھے۔ دوسرے دن میں نے سرینگر ٹیلی فون کیا، تو معلوم ہوا کہ مس طاہرہ شہمیری کو جموں طلب کرلیا گیا ہے۔ اور سرینگر کے اخبارات میں ان کے وزارتی کونسل میں لئے جانے کی خبر نمایاں طور شائع ہوئی ہے۔ اسی شام پارلیمنٹ کے مرکزی ہال میں، ڈاکٹر کرن سنگھ سے میری اتفاقیہ ملاقات ہوئی، اور انہوں نے مجھے اطلاع دی کہ ریاستی کابینہ میں توسیع کا اعلان ہوگیا ہے۔ ساتھ ہی نئے منسٹروں کے نام بھی بتائے۔ جب انہوں نے مس طاہرہ شہمیری کی بجائے زینب بیگم کا نام لیا، تو میں نے ان کی اصلاح کرتے ہوئے کہا کہ زینب بیگم نہیں، مس شہمیری کو وزیر بنایا گیا ہے ڈاکٹر صاحب نے میری غلط فہمی رفع کرنے کے لئے پھر

وضاحت کردی۔ کہ توسیع شدہ وزارت میں مس شہمیری کو نہیں، زینب بیگم کو لیا گیا ہے، لیکن مجھے یاد تھا کہ میرے زینب بیگم کا نام تجویز کرنے پر شیخ صاحب نے کیا شدید ردِ عمل ظاہر کیا تھا۔ اور یہ ابھی صرف ۴۸ گھنٹے پہلے کی بات تھی۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب کے بار بار کہنے پر بھی مجھے اُس وقت تک ان کی بات کا اعتبار نہیں آیا۔ کہ جب تک میں نے خود جموں ٹیلی فون کر کے اس کی تصدیق نہیں کی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ عین اُس وقت جبکہ نئے وزیروں کے ناموں کا اعلان کیا جانے والا تھا اور مس شہمیری کو باقاعدہ وزیر بنائے جانے کی اطلاع دی جا چکی تھی۔ وزیر اعظم اندرا گاندھی نے ذاتی طور مداخلت کر کے زینب بیگم کا نام تجویز کیا۔ اور چار و ناچار شیخ صاحب کو ان کی بات ماننا پڑی اس طرح زینب بیگم کی بدبختی خوش قسمتی میں اور مس طاہرہ شہمیری کی خوش بختی ان کی بدنصیبی میں بدل گئی۔

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند

دو چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہ گئے

یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب قانون ساز اسمبلی میں نیشنل کانفرنس کا کوئی ممبر نہیں تھا۔ اور خود شیخ صاحب بھی ابھی اسمبلی کے ممبر نہیں بنے تھے، لیکن تعجب ہے کہ اس کے باوجود وہ کابینہ میں عورتوں کو نمائندگی دینے کے لئے کوشاں تھے۔ آج نہ صرف یہ کہ انہیں ریاست کی قانون ساز اسمبلی میں بھاری اکثریت حاصل ہے بلکہ اپنی جماعت اپنی حکومت اور اپنی ریاست میں انہیں مختار کل کی حیثیت حاصل ہے۔ ریاستی اسمبلی اور حکومت میں

عورتوں کو کوئی نمائندگی نہیں دی گئی ہے۔ حیرت اس بات پر ہے کہ نیشنل کانفرنس نے حالیہ انتخابات میں ایک بھی خاتون کو اسمبلی کا منڈیٹ نہیں دیا۔ حالانکہ نیا کشمیر میں مردوں اور عورتوں کو برابر حقوق دیئے جانے کی یقین دہائی اتنی ہی پرانی ہے کہ جتنی نیشنل کانفرنس۔ اسمبلی انتخابات میں نیشنل کانفرنس کی زبردست کامیابی کے بعد یہ اُمید تھی، کہ قانون ساز کونسل کی کچھ نشستوں پر خواتین کو نامزد کر کے کابینہ میں شامل کر دیا جائے گا۔ لیکن ان نشستوں پر بھی جموں کے کچھ ریٹائرڈ سرکاری ملازموں نے قبضہ کر لیا ہے۔ اور اس طرح ریاستی کابینہ میں صنف نازک کو نمائندگی ملنے کی بچی کھچی اُمید بھی ختم ہو گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خواتین کشمیر کے ساتھ اس ناانصافی کا تدارک ہو جانا چاہیے۔ اور ہمیں اپنی سیاسی زندگی میں عورتوں کو برابر کے حقوق دینے کے لئے پرانے وعدے کو سیاسی مصلحتوں اور مجبوریوں کی قربان گاہ پر قربان نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بات ہم سب کیلئے شرمندگی کا باعث ہونا چاہئے کہ اب کی بار ۷۶ ممبروں کی اسمبلی میں صرف ایک خاتون ممبر ہے اور اس کا تعلق بھی نیشنل کانفرنس سے نہیں، جنتا پارٹی سے ہے۔

چار سال پہلے چار سال بعد:۔

یہ تین چار سال پرانی بات ہے، ابھی نہ صرف یہ کہ شیخ صاحب نے حکومت کی ذمہ داریاں نہیں سنبھالی تھیں۔ بلکہ ان کے اقتدار میں آنے کا کوئی امکان بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں کچھ شکوک وشبہات پیدا ہو گئے، تو میں نے شیخ صاحب کی صحیح تاریخ پیدائش کا

تعین کرنے کے لئے کچھ تحقیق کرنے کا ارادہ کیا۔ اپنی تحقیق کے سلسلے میں شیخ صاحب کے چند پرانے ساتھیوں، کچھ بزرگوں اور مورخ قسم کے لوگوں سے ملاقات کرنے کے بعد آخر میں شیخ صاحب کے ایک نہایت ہی قریبی رشتے دار کے پاس پہنچ گیا۔ مذکورہ رشتے دار کی بزرگی، اور شیخ صاحب سے ان کی بے پناہ قربت کے پیش نظر، شیخ صاحب کی تاریخ پیدائش کے متعلق ان کی شہادت بہت اہم تھی۔ لیکن جب میں نے اس مرد بزرگ سے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔ تو حضرت بے حد خفا ہو گئے کہ اس معمولی سی بات پر اتنا ہنگامہ کیوں؟ شیخ عبداللہ ۱۸ جنوری کو پیدا ہوئے یا ۲۰ جنوری کو، اس سے آپ کو یا کسی اور کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ میں نے شیخ صاحب کے اس نہایت قریبی رشتے دار کو یہ سمجھانے کی کوشش کی، کہ شیخ صاحب کا سیاسی مرتبہ کتنا اونچا ہے۔ اور کس طرح ان کی زندگی کے ایک ایک واقعے سے کشمیر کی تحریک اور تاریخ منسوب ہے۔ تو وہ اور برہم ہو گئے اور کہنے لگے کہ تم ہی جیسے لوگوں نے شیخ عبداللہ کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے جو کچھ شیخ صاحب کے متعلق کہا وہ میں ضبط تحریر میں نہیں لا سکتا۔ لیکن اس کا مفہوم یہ تھا کہ شیخ صاحب بہت معمولی آدمی ہیں۔ ان میں کوئی بزرگی، کوئی بڑائی نہیں ہے۔ اور اس ترنگ میں انہوں نے یہ انکشاف بھی فرمایا، کہ شیخ صاحب کی عمر در اصل ۷۳ سال ہے۔ ۷۱ نہیں یہ چار سال پرانی بات ہے۔ اس کے دو سال بعد شیخ صاحب نے ریاست کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے چارج سنبھالا، تو ایک دن ان کی قیام گاہ پر اس مرد بزرگ سے بھی مڈھ بھیڑ ہوئی۔ اس کے

بعد ان سے شیخ صاحب ہی کے ہاں کئی بار ملاقات ہوئی۔ اور میں نے انہیں شیخ صاحب سے اس طرح اظہار محبت کرتے دیکھا کہ جیسے شیخ صاحب، شیخ محمد ابراہیم کے نہیں، انہی کے بیٹے ہیں۔ اسے کہتے ہیں اقتدار کا معجزہ۔ کہ جو نفرت کو محبت میں، اور محبت کو نفرت میں بدلتا ہے۔

مولانا کی ستم ظریفی:۔

یہ صرف دو ہفتوں کی بات ہے، میں ایک دن صبح کے ساڑھے نو یا دس بجے کے قریب مولانا محمد سعید مسعودی کی موجودہ قیام گاہ فارسٹ لاج پہنچا، مولانا کے پاس اُس وقت ایک ایسے صاحب بیٹھے تھے کہ جن کو میں چہرے بشرے سے تو پہچانتا ہوں۔ لیکن ان سے پوری طرح متعارف نہیں ہوں۔ میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی یہ صاحب کچھ اس تپاک سے ملے کہ جیسے مجھے بہت عرصے سے جانتے ہوں، اس کے کچھ دیر بعد تک وہ مولانا سے حالات حاضرہ اور موجودہ سیاست پر گفتگو کرتے رہے۔ ان کی باتوں سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مولانا کو تحریک حریت کے ابتدائی ایام سے جانتے ہیں اور انہیں ان کی ذات سے بے حد عقیدت ہے۔ مولانا کچھ دیر تک ہوں ہاں کرتے رہے اور پھر آخر میں دریافت کیا، کہ آج کل آپ کہاں رہ رہے ہیں۔ اور کیا کرتے ہیں؟ اس پر اس مرد بزرگ نے تفصیل سے اپنی موجودہ تاریخ اور جغرافیہ بیان کیا اور خدا خدا کر کے وہ وہاں سے رخصت ہو گئے۔ میں نے مولانا سے پوچھا کہ یہ حضرت کون تھے۔ اور آپ سے اس والہانہ عقیدت کی شان نزول کیا ہے؟ تو مولانا مسکراتے ہوئے کہا کہ یہ وہی

صاحب ہیں جو ۱۹۳۲ء میں میری پہلی گرفتاری کرتے وقت اُس تھانے میں تھانے دار تھے، کہ جہاں مجھے رکھا گیا تھا۔ اور موصوف نے گرفتاری کے بعد مجھے بُری طرح اور بڑی بے دردی سے مارا تھا۔ یہ مجھے اپنی روداد سناتے سناتے بار بار کہتے تھے کہ آپ کو تو یاد ہی ہوگا۔ لیکن اب میں اس بے چارے کو کیا یاد دلاتا، کہ مجھے کیا یاد ہے اور کیا یاد نہیں! مولانا نے یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے مجھ سے تاکید کی تھی کہ میں کسی سے اس کا ذکر نہ کروں۔ لیکن واقعہ اتنا دلچسپ ہے کہ اسے بیان کئے بغیر میرا کھانا ہضم نہیں ہوگا۔

☆

شخصیات

غلام محی الدین ملک، ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور شری بھیم سنگھ

غلام محی الدین ملک:-

ریاستی اسمبلی کے موجودہ سپیکر غلام محی الدین ملک اسمبلی کی تاریخ میں غالباً سب سے کم عمر اور ناتجربہ کار سپیکر ہیں۔ وہ پیشے کے اعتبار سے وکیل ہیں، لیکن ان کی سیاست کی طرح ان کی وکالت بھی محض ایک سائن بورڈ ہے، انہیں قریب سے جاننے والوں کا کہنا ہے، کہ خواجہ غلام محمد شاہ کی طرح ان کی وکالت بھی ان کی قانونی مہارت کی بجائے ان کی سیاسی اثر ورسوخ کے سہارے چلتی تھی۔ ملک صاحب پانپور کے رہنے والے ہیں۔ اور پانپور سرینگر سے تقریباً ۸ میل دور ہے۔ یعنی نہ سرینگر کا حصہ اور نہ سرینگر سے اتنی دور کہ اسے دیہات میں شامل سمجھا جائے۔ ملک صاحب کے اسی پریشان کن جغرافیہ نے ان کی تاریخ اور تقدیر بدل دی۔ وہ دیہاتی ہوتے، تو اب کی بار ضرور نائب وزیر بنتے شہری ہوتے، تو وزیر مملکت بننے کا امکان یقینی تھا۔ لیکن وہ نہ یہ تھے اور نہ وہ...... اس لئے وہ سپیکر بن گئے...... سپیکر کا منصب، پارلیمانی نظام میں، بہت اونچا منصب ہے۔ اور اس کے لئے عمر تجربہ، علم،

ذہانت، جرأت، قوت فیصلہ اور بڑے تحمل اور بردباری کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن ملک صاحب کے سپیکر منتخب ہو جانے میں ان تمام خصوصیات کی موجودگی کی بجائے ان کی عدم موجودگی زیادہ کارگر ثابت ہوئی ہے اور اگر میرا اندازہ صحیح ہے تو ملک صاحب کو سپیکر اس لئے بنا دیا گیا۔ کہ وزارتی عہدوں کے اُمیدواروں اور طلب گاروں میں سے کوئی اور سپیکر بننے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس لئے چاروناچار پانپور کے اس غریب اور بے زبان نوجوان پر یہ بوجھ ڈالا گیا۔ کہنے والوں کا کہنا ہے۔ کہ ٹرانسپورٹ کے وزیر خواجہ غلام محمد شاہ، اپنے برادرِ اصغر خواجہ غلام محی الدین شاہ کو سپیکر بنانا چاہتے تھے۔ لیکن بیگ صاحب نے اس کی مخالفت کر کے شاہ خاندان کو اس منصب سے محروم کروادیا۔ (یہ غالباً پہلا موقع ہے کہ جب شاہ صاحب کے مقابلے میں بیگ صاحب کی جیت ہوئی ہے) غلام محی الدین ملک اور اوڑی کے محی الدین ۱۹۷۵ء سے قبل مرکزی لیڈروں کے ساتھ مرزا محمد افضل بیگ کی بات چیت کے دوران بیگ صاحب کے بستہ بردار تھے۔ اور بیگ صاحب نے اپنے Sense of Humor کا مظاہرہ کرتے ہوئے دونوں غریبوں کو آئینی مشیر کا نام دیا تھا۔ ملک صاحب کا سپیکر بننا غالباً انہی خدمات کا صلہ ہے۔ اور بے چارے اوڑی والے محی الدین کی کمند اس وقت ٹوٹ گئی۔ کہ

دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گئے

ملک صاحب جب سپیکر منتخب ہوئے، تو میری ہی طرح بہت سے لوگوں کو یہ اندیشہ تھا، کہ یہ کم عمر، ناتجربہ کار اور کمزور نوجوان محض برائے نام

سپیکر ہوگا۔ اور اسے حکمران جماعت اپنے اشاروں پر نچائے گی۔ لیکن ایک ماہ کی تین مدت میں۔ ملک صاحب نے اپنے رکھ رکھاؤ اور اپنی کارکردگی سے ہمارے اندیشے بہت حد تک غلط ثابت کردیئے۔ کئی مواقع پر انہوں نے غیر متوقع طور بڑی جرأت اور ہمت کا مظاہرہ کر کے ثابت کردیا۔ کہ وہ جسمانی طور کمزور اور لاغر ہونے کے باوجود ذہنی طور خاصے صحت مند ہیں۔ وہ اگرچہ پارلیمانی قواعد وضوابط سے ابھی پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ اور نہ انہیں پارلیمانی روایات کا علم ہے۔ لیکن وہ جس رفتار اور اعتماد سے اپنے فرائض انجام دینے لگے ہیں۔ اس کے پیش نظر یہ کہنا مبالغہ نہیں۔ کہ اگر وہ اسی طرح سے محنت اور ریاضت کرتے رہے۔ تو وہ ایک اچھے اور کامیاب سپیکر ثابت ہوسکتے ہیں۔ ملک صاحب کو اپنے اندر جرأت پیدا کرنا چاہیے۔ کیونکہ سپیکر کی سب سے بڑی خوبی اس کی علوہمتی اور جرأت ہے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہورہی ہے کہ ملک صاحب نے اپنی کارکردگی سے میرے بہت سے اندازے غلط ثابت کردئے ہیں۔

ڈاکٹر فاروق عبداللہ :-

آج کل کسی وزیر کا کوئی عزیز نرمی، سلیقے، تمیز اور تہذیب سے بات کرے تو اس کے وزیر کے اصلی رشتہ دار ہونے میں شبہ ہونے لگتا ہے۔ کیونکہ وزیروں کے مقابلے میں ان کی عزیز واقارب زیادہ خونخوار، تیز رفتار اور گرم گفتار ہوتے ہیں۔ سیاسی آسمان پر سابق وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے صاحبزادے سنجے گاندھی کے طلوع ہوجانے کے بعد سے تو ہر وزیر اور

وزیراعلیٰ کا صاحبزادہ اپنے آپ کو باپ کا جاں نشین سمجھنے لگا ہے اور ہمارے معاشرے میں ایسے مصاحبوں اور خوشامدیوں کی کمی نہیں ، کہ جوان صاحبزادوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کرتے ہیں۔ کہ ان میں ہر انسانی خوبی اور کمال موجود ہے۔ اس پس منظر میں وزیراعلیٰ جناب شیخ محمد عبداللہ کے بڑے صاحبزادے فاروق عبداللہ سے مل کر ایک خوش اور حیرت اور خوش کن تجربے کا احساس ہوتا ہے۔ فاروق صاحب اپنے لب و لہجے دوسروں سے برتاؤ اور اپنے والد محترم کے سیاسی مخالفین کے تئیں اپنے رویے سے کسی تحکم، تکبر یا احساس برتری کا اظہار نہیں کرتے۔ اور آج کے زمانے میں یہ بہت بڑی بات ہے۔ میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر فاروق کے طرزِ عمل اور ان کے موجودہ رویے کا ان کے انگلستان میں تیرہ سالہ قیام سے گہرا تعلق ہے۔ اور ان کے لہجے کی نرمی، ان کی خوش اخلاقی اور ہر ایک سے ہنس کر بات کرنے کی ادا، اگرچہ ان کی اپنی طبیعت اور اپنے مزاج کا خاصہ ہے لیکن انگلستان نے اسے ان کی شخصیت کا حصہ بنا کر انہیں ایک بہتر انسان بننے میں مدد کی ہے۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ ان کے چھوٹے برادر طارق عبداللہ انگلستان، فرانس اور امریکہ میں رہنے کے باوجود اس تربیت اور اس اثر سے محروم رہ گئے ہیں۔

فاروق عبداللہ کو میں ان کی طالب علمی کے زمانے سے جانتا ہوں۔ اور طالب علم کی حیثیت سے وہ میری ہی طرح اوسط درجے کے طالب علم تھے۔ لیکن ڈاکٹر بننے کے بعد ان کی شخصیت میں کچھ اہم اور نمایاں تبدیلیاں

پیدا ہوگئی ہیں اور یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اپنے بات کے اقتدار اور ان کے سیاسی مرتبے نے ان کا دماغ خراب کرنے کی بجائے ان کی شخصیت میں نرمی، ان کے لہجے می شائستگی اور دوسروں کے ساتھ ان کے برتاؤ میں ایک سلیقہ اور رکھ رکھاو پیدا کیا ہے۔ وہ اقتدار کی آلاشیوں سے پوری طرح پاک نہیں ہیں۔ اور کبھی کبھی وہ والدِ محترم کے سیاسی اقتدار کو اپنا خاندانی ورثہ سمجھ کر سیاست میں بھی ٹانگ اڑاتے رہتے ہیں۔ لیکن میری اطلاع ہے کہ شیخ صاحب اپنے صاحبزادے کی سیاست میں دخل اندازی کے رجحان کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے۔ بہر حال میرے نزدیک یہ بات اہم نہیں ہے۔ کہ ڈاکٹر فاروق سیاست میں سرگرم ہو جائیں یا نہیں۔ لیکن سیاست اور حکومت دونوں میں دخل اندازی کے باوجود اگر وہ اپنی خوش اخلاقی، خوش گفتاری اور خوش تمیزی کو برقرار رکھ سکیں تو بڑی بات ہے۔ کیونکہ شیخ صاحب کے کچھ قریبی اور کچھ دور دراز رشتے داروں نے اپنی فرعونیت، اپنی زبان اور اپنے طرزِ عمل سے بہت سے لوگوں کو نالاں کر دیا ہے۔ اور ایسے لوگ وزیر اعلیٰ سے اپنی قربت کا ناجائز فائدہ اُٹھا کر ان کی بدنامی کا موجب بن رہے ہیں۔ اس ماحول میں ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی خوش کلامی اور نرم روی، گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن سے کم نہیں۔

شری بھیم سنگھ:۔

کچھ لوگوں کا ذہنی ارتقاء ایک خاص نکتے پر آ کر رُک جاتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ بڑھاپے میں بھی بچپنے کی حرکتیں کرتے رہتے

ہیں، ریاستی اسمبلی کے کانگریسی ممبر شری بھیم سنگھ کے بارے میں میری یہ رائے ہے کہ اس کا ذہنی ارتقاء بائیس برس کی عمر تک پہنچ کر رُک گیا ہے۔اور آثاروقرائن بتارہے ہیں کہ وہ جسمانی طور اسی سال کی عمر تک پہنچنے کے بعد بھی ذہنی طور بائیس ہی سال کا الھڑ نوجوان رہے گا۔سنا تھا کہ اگر انسان تو کیا ،ایک جانور کو بھی دنیا کے سفر پر بھیج دیا جائے۔تو واپسی پر وہ ایک بہتر اور مہذب جانور بن کر لوٹے گا۔لیکن بھیم سنگھ ساری دنیا کا سفر کرنے کے بعد بھی جہاں گیا تھا۔ویسا ہی لوٹ آیا ہے۔میں اسے ۱۹۶۵ء سے جانتا ہوں۔ کہ جب ہم دونوں علی گڈھ میں قانون کے طالب علم تھے۔جب سے اب تک دنیا بدل گئی ہے لیکن بھیم سنگھ نہیں بدلا ہے۔وہی غیر سنجیدہ گفتگو، وہی ہلڑ بازی، وہی بازاری ڈاکٹروں کی طرح بات بات پر تقریر جھاڑنے کی عادت۔دراصل وہ ابھی تک عنفوان شباب کی اس منزل سے باہر نہیں آیا ہے۔کہ جب انسان اپنے آپ پر عاشق ہوتا ہے اور اپنی ذات کو ساری کائنات کا مرکز سمجھتا ہے۔وہ شاید کبھی اس نفسیاتی کیفیت سے آزاد بھی نہ ہو سکے۔ریاستی اسمبلی کے حالیہ انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد کچھ لوگوں کو یہ اُمید پیدا ہوگئی تھی کہ بھیم سنگھ اپنے علم، اپنے تجربے اور اپنی ذہانت سے فائدہ اُٹھا کر کوئی تعمیری رول ادا کرے گا۔لیکن بھیم سنگھ نے شروع سے ہی اپنے کردار اور عمل سے یہ غلط فہمیاں دور کر دی ہیں اور یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔

بھیم سنگھ کے پاس زبان ہے۔معلومات ہیں۔تجربہ ہے اور سب

سے بڑی بات یہ کہ اس کے پاس جرأت ہے۔ لیکن اس کی شخصیت کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس کی زندگی میں کوئی مقصد، کوئی منزل، کوئی نصب العین نہیں ہے۔ اور وہ سنسنی پیدا کر کے اخباروں میں اپنا نام چھپوانے کو ہی اپنی منزل سمجھ بیٹھا ہے۔ گاندھی جی نے کہا تھا کہ جس شخص کے دل میں ہر روز اخبار میں اپنا نام دیکھنے کی خواہش پیدا ہو جائے۔ وہ اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے کچھ بھی کرنے کے لئے تیار ہو گا۔ بھیم سنگھ کو بھی ہر روز اخبار میں اپنا نام دیکھنے کا چسکہ پڑ گیا ہے۔ اور اسی لئے وہ کوئی نہ کوئی ہنگامہ بپا کر کے اخبار والوں کو مواد مہیا کر رہا ہے۔ بظاہر بھیم سنگھ کا تعلق کانگریس سے ہے لیکن بنیادی طور وہ نہ کانگریس کے ساتھ ہے۔ اور نہ کسی دوسری جماعت سے، وہ ذہنی طور انارکسٹ ہے اور وہ ساری عمر انارکسٹ ہی رہے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ بھیم سنگھ اپنی بے پناہ اور غیر معمولی صلاحیتوں کو ہنگامہ خیزی اور سنسنی خیزی میں برباد کر رہا ہے۔

☆

۳ راگست ۱۹۷۶ء

ایک سال ایک نظر

آج کے دن روزنامہ ''آئینہ'' نے اپنی زندگی کا پہلا سال مکمل کرلیا ہے اور اس کے ساتھ ہی ''آئینہ'' کی اشاعت کے بارہ سال پورے ہوجاتے ہیں۔ ہفت روزہ ''آئینہ'' اور روزنامہ ''آئینہ'' مزاج، کردار اور مقاصد کے اعتبار سے ایک دوسرے سے اس درجہ مختلف ہیں کہ روزنامہ ''آئینہ'' کو ہفت روزے کی توسیع یا تکرار کہنا غلط ہوگا ہفتہ روزہ ''آئینہ'' ایک اخبار نہیں، ایک جریدہ تھا۔ ایک ذہنی تحریک اور ایک شخصیت کے اظہار اور اشتہار کا وسیلہ، اس کی اشاعت محدود، مگر اس کا حلقہ اثر لامحدود تھا، بقول آل احمد سرور وہ خبر کا نہیں، نظر کا اخبار تھا۔ روزنامہ ''آئینہ'' اُردو میں چھپنے والے بہت سے اخبارات میں سے ایک اخبار ہے اور اس کا مقصد اپنے پڑھنے والوں کو زیادہ سے زیادہ اور تازہ بہ تازہ خبریں فراہم کرنا ہے۔ اِس میں شخصیت کے اشتہار کو نہیں، بلکہ کاروباری اشتہارات کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس میں ایڈیٹر سے زیادہ پڑھنے والوں کی شخصیات اور ان کی نفسیات کی بھرپور جھلک ملتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہفت

روزہ ''آئینہ'' میرا اخبار تھا اور روز نامہ آپ کا اخبار ہے۔ اپنی شخصیت کو آپ کی شخصیت میں مدغم کرنے کا فیصلہ میرا ذاتی فیصلہ تھا۔ اور اس میں کسی مجبوری یا مصلحت کا دخل نہیں تھا۔ میں اپنی ذات کے حصار کو توڑ کر کائنات میں گم ہو جانا چاہتا تھا اور پچھلے ایک سال کے دوران میرا ہر قدم اس سمت میں اُٹھتا ہے۔ آج ''آئینہ'' سرینگر سے شائع ہونے والے بہت سے اچھے اور بڑے اخبارات میں سے ایک اخبار ہے، اس کی نہ کوئی انفرادیت ہے اور نہ کوئی امتیازی شان، اس میں نہ میری شخصیت کی کوئی جھلک ہے اور نہ میرے اسلوب کی، بلکہ کئی بار اس میں شائع ہونے والی تحریروں سے میرا متفق ہونا بھی ضروری نہیں، روز نامے کی یہی روایت ہے اور روایت سے بغاوت کرنے کا حوصلہ اب مجھ میں باقی نہیں رہا ہے۔ بلکہ حق بات یہ ہے کہ میں رفتہ رفتہ روایات کی پیروی کا عادی ہوتا جا رہا ہوں۔ اسے میرے بڑھاپے سے تعبیر کیجئے یا ذہنی پختگی سے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے زمانے کے بے رحم حقائق کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور ہفت روزہ کو روز نامہ بنانے کی تحریک اور توفیق مجھے اسی احساس اور عرفان سے ہوئی ۔

ہر لحظ مجھ کو تازہ بلاؤں کا سامنا
نا آزمودہ کاری جرأت کہاں سے لاؤں

''آئینہ'' کو روز نامہ بنانے کا فیصلہ میں نے آج سے ایک سال قبل اُس وقت کیا تھا کہ جب پورے ملک کی صحافت پر ایمرجنسی کے گہرے اور کالے بادل منڈلا رہے تھے، اور تحریر و تقریر کی آزادی اس درجہ محدود کر دی

گئی تھی کہ سانس لینا بھی مشکل تھا، یہ وہ وقت تھا کہ جب بہت سے کام یاب اخبارات گھٹ گھٹ کر مر رہے تھے، اور جو زندہ تھے، وہ مردوں سے بھی بدتر، ان حالات میں ہفت روزے کو روزنامہ بنانے کا فیصلہ بہت سے لوگوں کی طرح مجھے بھی کچھ عجیب سا لگا۔ لیکن اس کے باوجود میرے لئے یہ عجیب سا فیصلہ بہت ضروری بن گیا تھا۔ اسی لئے میں نے نہایت مخدوش حالات میں یہ غیر متوقع قدم اُٹھایا، اور مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ آج ایک سال بعد مجھے اپنے اس فیصلے پر نادم یا شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

''آئینہ'' کو روزنامہ بنانے سے قبل اور اس کے بعد میں نے اپنے قارئین کے ساتھ کچھ وعدے کئے تھے، اپنے لئے کچھ معیار قائم کئے تھے اور ''آئینہ'' کو صاف ستھری صحافت کا آئینہ دار بنانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ میں اپنے ان مقاصد میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں۔ اس کا فیصلہ آپ کر سکتے ہیں۔ جہاں تک میرے علم اور میری واقفیت کا تعلق ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ بحیثیت مجموعی ''آئینہ'' نے بازاری صحافت اور لوچ قسم کی تحریروں سے اپنے دامن کو آلودہ نہیں ہونے دیا ہے۔ اس نے صحافتی دیانت اور شرافت کی قدروں کا احترام کیا ہے۔ اخلاق سوز خبروں کی اشاعت سے پرہیز کیا ہے اور جب کبھی غیر ارادی طور یا سہواً عملے کی کسی فرد کی لاپرواہی یا غیر ذمہ داری سے کوئی ناشایاں خبر، مراسلہ یا تحریر شائع ہوئی ہو، ہم نے فوراً ہی اس پر ندامت اور شرمندگی کا اظہار کر کے اس کی تلافی کرنے کی کوشش کی ہے۔

ابھی حال ہی میں میری غیر موجودگی میں سرینگر ٹیلی ویژن کے ایک آرٹسٹ کے خلاف اس اخبار میں ایک غلط، بے بنیاد اور سنسنی خیز خبر شائع ہوئی تھی۔ صحیح حالات معلوم ہونے پر ہم نے نہ صرف اس کی تردید کی۔ بلکہ میں نے ذاتی طور پر آرٹسٹ سے اس زیادتی اور ناانصافی کے لئے معافی مانگی۔ بعض مقامی اخبارات کے لئے جرائم اور جنسی خبروں کی اشاعت باقاعدہ ایک تجارت کا درجہ رکھتی ہے۔ اس لئے میرے عملے کے لوگ بھی، میری غیر حاضری کا فائدہ اُٹھا کر اس مقابلے میں شرکت کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ میں اگرچہ اس قسم کی تمام ناشائستہ تحریروں کی اخلاقی ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔ لیکن میں نے اپنے تمام ساتھیوں کو سخت تاکید کی ہے کہ وہ اس قسم کے غیر صحت مند مقابلے سے پرہیز کریں۔ مجھے افسوس ہے کہ اس سلسلے میں مجھے سو فیصدی نہیں۔ صرف ستر فیصدی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اور میں کوشش کروں گا کہ اشاعت کے اس دوسرے سال میں، ہمیں اس سے بھی زیادہ کامیابی نصیب ہو۔

اسی اعتراف کے بعد کہ ''آئینہ'' اس شہر سے شائع ہونے والے بہت سے اچھے اور بُرے اخبارات میں سے ایک اخبار ہے۔ مجھے یہ دعویٰ کرنے کی بھی اجازت دیجئے کہ اس عامیانہ پن کے باوجود ''آئینہ'' کی بعض خصوصیات اتنی نمایاں اور اہم ہیں کہ جنہیں کوئی نظر انداز نہیں کرسکتا۔ ''آئینہ'' صالح سیاسی نظریات، بے لاگ تنقید اور بے خوف اظہار رائے کے اعتبار سے ایک منفرد شان کا حامل ہے۔ اس کے حلقہ اشاعت میں اس

ریاست کے پڑھے لکھے اور صاحب الرائے لوگ شامل ہیں اور اس میں شائع ہونے والے ایک ایک لفظ کو بغور پڑھا جاتا ہے۔ ''آئینہ'' غالباً ریاست سے شائع ہونے والا واحد اخبار ہے کہ جس کے ''ایڈیٹوریل'' اور اشتہارات کو سیاسی، سرکاری اور ادبی حلقوں میں خصوصی توجہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے، زبان و بیان کے اعتبار سے بھی اسے ایک منفرد حیثیت حاصل ہے اور اپنے اکثر ہم عصروں کے مقابلے میں اسے پڑھنے والوں کا زیادہ اعتبار اور اعتماد حاصل ہے اور جس بات پر ہمیں بجا طور پر فخر حاصل ہے، وہ یہ کہ ہم نے کبھی اپنی اشاعت بڑھانے یا سستی مقبولیت حاصل کرنے کے لئے اخلاق سوز تحریروں کی اشاعت یا ذاتی جھگڑوں کو اُچھالنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ ''آئینہ'' کو اس بات کا فخر ہے کہ ہمارے نقطہ نظر سے اختلاف رکھنے والے بھی اپنے بچوں اور عزیزوں کو ''آئینہ'' کے باقاعدہ مطالعے کی تلقین کرتے ہیں۔ تاکہ ان کی زبان اور ان کے اخلاق سُدھر جائیں۔ ایک روزنامہ اخبار کی عظمت اور اہمیت کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوسکتا ہے۔

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ ''آئینہ'' ابھی میرے ذہن اور میرے خوابوں کا آئینہ نہیں بن سکا ہے، اس کی کئی وجوہات ہیں اور سب سے بڑی وجہ ۱۶؍جون ۱۹۷۵ء کو ملک بھر میں نافذ ہونے والی ایمرجنسی ہے، جس نے تحریر و تقریر پر ایسی ایسی تعزیریں عائد کر کر دی ہیں کہ جن کی موجودگی میں قلم کو سیاہی میں ڈبوتے ہوئے بھی جرم کا احساس پیدا ہوجاتا ہے۔ ہم نے پچھلے ایک سال کی اشاعت کے دوران حتیٰ المقدور اور حتیٰ الامکان ایمرجنسی کے

قواعد وضوابط اور پابندیوں کا احترام کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن بارہا غیر ارادی اور غیر شعوری طور پر ہمارے قلم سے ایسی بھی گستاخیاں سرزد ہو گئیں کہ جس سے ارباب ایمر جنسی کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہو گئیں۔ میرے دفتر کی میز پر دو درجن سے زائد ایسے حکم نامے اور ہدایت نامے موجود ہیں کہ جن پر میری گستاخیوں اور شوخیوں کے لئے مجھے تنبیہ کر دی گئی ہے اور ان کو دیکھ کر مجھے میرؔ کا یہ شعر یاد آیا ہے ؎

جب نام ترا لیوے تب چشمِ بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

ملک کے حالات کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ایمر جنسی ابھی بہت دنوں تک نافذ رہے گی۔ ان حالات میں صحافت، کاروبار شوق نہیں، بلکہ کارے دارو والا معاملہ نظر آتا ہے۔ دیکھئے ہمارے حوصلے ہمارا کہاں تک ساتھ دیتے ہیں شاید آپ کی دعاؤں سے ایمر جنسی کا پل صراط پار کرنے کی توفیق عطا ہو جائے۔

میں ''آئینہ'' کی تیرھویں اور روزنامہ ''آئینہ'' کی پہلی سالگرہ پر آپ کو اور اپنے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔

☆

۷ستمبر ۱۹۷۷ء

شیخ صاحب کی حکومت
آوارہ گرد کے قلم سے

ریاستی اسمبلی کے حالیہ انتخابات کے دوران جنتا پارٹی کی ایک اُمیدوار ڈاکٹر جگت موہنی، ایک انتخابی جلسے میں شرکت کے بعد لوٹ رہی تھیں، کہ راستے میں کچھ غنڈوں نے ان پر قاتلانہ حملہ کر کے انہیں بُری طرح گھائل کر دیا۔ ان کے کئی دانت ٹوٹ گئے دونوں جبڑے بری طرح مجروح ہو گئے سر میں شدید چوٹیں آئیں، اور وہ کئی دن تک موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا رہیں۔ انہیں اسی نازک حالت میں دہلی پہنچایا گیا۔ اور وہاں آل انڈیا میڈیکل انسٹی چیوٹ میں ان کا علاج ہوا جہاں سے وہ کچھ دن بعد لوٹ آئیں۔ ان کی زندگی تو بچ گئی۔ لیکن وہ ابھی تک مکمل طور صحت یاب نہیں ہوئی ہیں۔ ان دنوں ریاست پر گورنر بہادر کا راج تھا۔ اس لئے ملزم فوراً ہی گرفتار کر لئے گئے اور ان کے خلاف قانونی کاروائی کا آغاز ہوا۔ اس دوران میں انتخابات مکمل ہو گئے۔ اور شیخ صاحب کی حکومت قائم ہو گئی۔ ابھی شیخ صاحب کی حکومت قائم ہوئے ٹھیک دو مہینے بھی نہیں گذرے ہیں کہ ڈاکٹر جگت موہنی پر قاتلانہ حملے کے الزام میں گرفتار شدہ ملزموں کو بعدم ثبوت

قواعد وضوابط اور پابندیوں کا احترام کرنے کی کوشش کی ہے۔لیکن بارہا غیر ارادی اور غیر شعوری طور پر ہمارے قلم سے ایسی بھی گستاخیاں سرزد ہوگئیں کہ جس سے ارباب ایمر جنسی کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہوگئیں۔ میرے دفتر کی میز پر دو درجن سے زائد ایسے حکم نامے اور ہدایت نامے موجود ہیں کہ جن پر میری گستاخیوں اور شوخیوں کے لئے مجھے تنبیہہ کردی گئی ہے اور ان کو دیکھ کر مجھے میرؔ کا یہ شعر یاد آیا ہے ؎

جب نام ترا لیوے تب چشمِ بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

ملک کے حالات کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ایمر جنسی ابھی بہت دنوں تک نافذ رہے گی۔ ان حالات میں صحافت، کاروبار شوق نہیں، بلکہ کارے دارو والا معاملہ نظر آتا ہے۔ دیکھئے ہمارے حوصلے ہمارا کہاں تک ساتھ دیتے ہیں شاید آپ کی دعاؤں سے ایمر جنسی کا پل صراط پار کرنے کی توفیق عطا ہو جائے۔

میں ''آئینہ'' کی تیرھویں اور روزنامہ ''آئینہ'' کی پہلی سالگرہ پر آپ کو اور اپنے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔

☆

۷ ستمبر ۱۹۷۷ء

شیخ صاحب کی حکومت
آوارہ گرد کے قلم سے

ریاستی اسمبلی کے حالیہ انتخابات کے دوران جنتا پارٹی کی ایک اُمیدوار ڈاکٹر جگت موہنی، ایک انتخابی جلسے میں شرکت کے بعد لوٹ رہی تھیں، کہ راستے میں کچھ غنڈوں نے ان پر قاتلانہ حملہ کر کے انہیں بُری طرح گھائل کر دیا۔ ان کے کئی دانت ٹوٹ گئے دونوں جبڑے بری طرح مجروح ہو گئے سر میں شدید چوٹیں آئیں، اور وہ کئی دن تک موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا رہیں۔ انہیں اسی نازک حالت میں دہلی پہنچایا گیا۔ اور وہاں آل انڈیا میڈیکل انسٹی چیوٹ میں ان کا علاج ہوا جہاں سے وہ کچھ دن بعد لوٹ آئیں۔ ان کی زندگی تو بچ گئی۔ لیکن وہ ابھی تک مکمل طور صحت یاب نہیں ہوئی ہیں۔ ان دنوں ریاست پر گورنر بہادر کا راج تھا۔ اس لئے ملزم فوراً ہی گرفتار کر لئے گئے اور ان کے خلاف قانونی کاروائی کا آغاز ہوا۔ اس دوران میں انتخابات مکمل ہو گئے۔ اور شیخ صاحب کی حکومت قائم ہو گئی۔ ابھی شیخ صاحب کی حکومت قائم ہوئے ٹھیک دو مہینے بھی نہیں گذرے ہیں کہ ڈاکٹر جگت موہنی پر قاتلانہ حملے کے اُلزام میں گرفتار شدہ ملزموں کو بعدم ثبوت

قواعد وضوابط اور پابندیوں کا احترام کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن بارہا غیر ارادی اور غیر شعوری طور پر ہمارے قلم سے ایسی بھی گستاخیاں سرزد ہوگئیں کہ جس سے ارباب ایمر جنسی کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہوگئیں۔ میرے دفتر کی میز پر دو درجن سے زائد ایسے حکم نامے اور ہدایت نامے موجود ہیں کہ جن پر میری گستاخیوں اور شوخیوں کے لئے مجھے تنبیہہ کردی گئی ہے اور ان کو دیکھ کر مجھے میرؔ کا یہ شعر یاد آیا ہے ؎

جب نام ترا لیوے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

ملک کے حالات کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ایمر جنسی ابھی بہت دنوں تک نافذ رہے گی۔ ان حالات میں صحافت، کاروبار شوق نہیں، بلکہ کارے وار و والا معاملہ نظر آتا ہے۔ دیکھئے ہمارے حوصلے ہمارا کہاں تک ساتھ دیتے ہیں شاید آپ کی دعاؤں سے ایمر جنسی کا پل صراط پار کرنے کی توفیق عطا ہو جائے۔

میں ''آئینہ'' کی تیرھویں اور روزنامہ ''آئینہ'' کی پہلی سالگرہ پر آپ کو اور اپنے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔

☆

۷ستمبر ۱۹۷۷ء

شیخ صاحب کی حکومت
آوارہ گرد کے قلم سے

ریاستی اسمبلی کے حالیہ انتخابات کے دوران جنتا پارٹی کی ایک اُمیدوار ڈاکٹر جگت موہنی، ایک انتخابی جلسے میں شرکت کے بعد لوٹ رہی تھیں، کہ راستے میں کچھ غنڈوں نے ان پر قاتلانہ حملہ کر کے انہیں بُری طرح گھائل کر دیا۔ ان کے کئی دانت ٹوٹ گئے دونوں جبڑے بری طرح مجروح ہو گئے سر میں شدید چوٹیں آئیں، اور وہ کئی دن تک موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا رہیں۔ انہیں اسی نازک حالت میں دہلی پہنچایا گیا۔ اور وہاں آل انڈیا میڈیکل انسٹی چیوٹ میں ان کا علاج ہوا جہاں سے وہ کچھ دن بعد لوٹ آئیں۔ ان کی زندگی تو بچ گئی۔ لیکن وہ ابھی تک مکمل طور صحت یاب نہیں ہوئی ہیں۔ ان دنوں ریاست پر گورنر بہادر کا راج تھا۔ اس لئے ملزم فوراً ہی گرفتار کر لئے گئے اور ان کے خلاف قانونی کاروائی کا آغاز ہوا۔ اس دوران میں انتخابات مکمل ہو گئے۔ اور شیخ صاحب کی حکومت قائم ہو گئی۔ ابھی شیخ صاحب کی حکومت قائم ہوئے ٹھیک دو مہینے بھی نہیں گذرے ہیں کہ ڈاکٹر جگت موہنی پر قاتلانہ حملے کے الزام میں گرفتار شدہ ملزموں کو بعدم ثبوت

بری کر دیا گیا ہے اور فاضل جج نے اپنے فیصلے میں لکھا ہے کہ پولیس ملزموں کے خلاف شہادت ثبوت پیش کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اس لیئے انہیں بَری کر دیا جاتا ہے۔ معاملہ بظاہر بہت معمولی اور سیدھا سادا نظر آتا ہے۔ لیکن اس سے شیخ صاحب کی حکومت کے مزاج، کردار اور عزائم کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اور یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ شیخ صاحب کے دور اقتدار میں انصاف، اخلاق اور قانون کی کچھ نئی قدریں وضع ہو رہی ہیں۔ ڈاکٹر جگت موہنی کا تعلق چونکہ جنتا پارٹی سے تھا۔ اس لئے پولیس کے لئے ان پر قاتلانہ حملہ کرنے والوں کا سراغ لگانا ضروری نہیں سمجھا گیا۔ ان کا تعلق اگر نیشنل کانفرنس سے ہوتا، تو پھر پولیس اصلی مجرموں کو چھوڑ کر نقلی ملزموں کو گرفتار کرنے سے دریغ نہ کرتی، عدل اور انصاف کے یہ نئے معیار شیخ صاحب کی حکومت کا تحفہ ہے۔ اور ہمیں تعجب نہیں ہوگا کہ اگر ملزموں کے خلاف شہادت ثبوت فراہم نہ کرنے کی کارکردگی کی بناء پر متعلقہ پولیس آفسروں کو ترقی اور انعام سے نوازا جائے۔ ڈاکٹر جگت موہنی کیس کی تحقیقات کرنے والے افسر اپنی جگہ مطمئن ہوں گے، کہ انہوں نے اپنی کارکردگی سے شیخ صاحب کی خوشنودی حاصل کی ہے لیکن نئے انسپکٹر جنرل پولیس شری ڈی، این، کول کو اس بات کا جائزہ لینا ہوگا کہ یہ کون سے پولیس آفسر ہیں کہ جن کی فرض ناشناسی، لاپرواہی اور بددیانتی مجرموں کی رہائی کا سبب اور ریاستی پولیس کی تذلیل کا باعث بن گئی ہے۔ ان پولیس افسروں کو یہ نہیں بھولنا چاہیے۔ کہ پاکستان کے سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو پرسوں ہی تین سال پہلے دائر

کئے گئے ایک مقدمہ قتل میں بحیثیت ملزم کے گرفتار کر لئے گئے ہیں۔ سیاسی مصلحتیں اور رقابتیں قاتلوں کو کچھ دنوں، مہینوں یا سالوں کے لئے بچا سکتی ہیں۔ لیکن انہیں ہمیشہ کیلئے تحفظ نہیں دے سکتیں۔ میں ریاستی پولیس کے ان افسروں کو، کہ جن کی فرض ناشناسی ملزموں کے بَری کئے جانے کا سبب بن گئی۔ یقین دلاتا ہوں کہ پانچ سال، آٹھ سال، بلکہ دس سال بعد جب بھی اس ریاست پر قانون اور انصاف کی حکومت بحال ہوگی۔ ڈاکٹر جگت موہنی پر قتل کا حملہ کرنے والے اصلی ملزموں کے ساتھ ساتھ پولیس کے وہ افسر بھی قانون کے شکنجے میں کس دیئے جائیں گے کہ جنہوں نے آج شیخ صاحب کو خوش کرنے کے لئے دیانتداری سے اپنے فرائض انجام دینے میں کوتاہی کی۔ ملزموں کی یہ رہائی خود شیخ صاحب کی حکومت کے لئے بھی نیک نامی کا باعث نہیں ہوسکتی۔

☆ محمد سلیم نواب بازار کے ایک بہت ہی غریب گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی عمر ۲۷ یا ۲۸ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ لیکن وہ تیس پینتیس سال سے کم نہیں لگتا۔ وہ ایک مدت سے معدے کے مرض میں مبتلا ہے اور کبھی کبھی اس کا درد ناقابلِ برداشت بن جاتا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں وہ صدر ہسپتال سرینگر میں اپنا علاج معالجہ کرانے کے لئے گیا۔ اور خوش قسمتی سے ہمارے ایک بہت ہی قابل تجربہ کار اور ماہر سرجن ڈاکٹر بھان نے اس کا ملاحظ کر کے اسے معدے کا ایکسرے اُٹھانے کی ہدایت کی۔ محمد سلیم ڈاکٹر صاحب کا ہدایت نامہ لے کر ہسپتال کے ایکسرے ڈیپارٹمنٹ کے متعلقین کے پاس

پہنچا۔ تو انہوں نے اسے بتایا کہ یہ ایکسرے ہسپتال میں نہیں ہو سکتا، کسی پرائیویٹ کلنک میں کیا جانا چاہیے۔ یہ بات محمد سلیم کی سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن جب بدن کا انگ انگ دُکھ رہا ہو، تو نہ سمجھ میں آنے والی بات بھی سمجھ میں آ ہی جاتی ہے۔ دوسرے دن محمد سلیم ایک پرائیویٹ کلنک پر ایکسرے کرانے گیا تو اس کے پاس کل سولہ روپے تھے۔ لیکن وہاں جا کر اسے معلوم ہوا کہ ایکسرے میں سولہ نہیں ساٹھ روپے لگیں گے۔ محمد سلیم کی ماہانہ آمدن سو یا سوا سو روپے سے زیادہ نہ ہوگی۔ اس لئے اس کے لئے بیک وقت ساٹھ روپے بہم کرنا اتنا ہی مشکل ہے۔ جتنا موجودہ حکومت کے لئے سینکڑوں بے کار گریجویٹوں کو کام مہیا کرنا۔ محمد سلیم ڈاکٹر صاحب کا نسخہ لے کر میرے پاس آیا۔ کہ میں اس کی کچھ مدد کروں، اور میں نے ڈاکٹر بھان صاحب کے نام ایک خط میں انہیں محمد سلیم کی اقتصادی حالت سے آگاہ کیا۔ اور ان سے درخواست کی، کہ وہ اس غریب کا ہسپتال میں ہی ایکسرے کروائیں۔ کیونکہ وہ کسی قیمت پر ساٹھ روپے دے کر ایکسرے کروانے کی استطاعت نہیں رکھتا، دوسرے دن محمد سلیم کے ذریعے مجھے ڈاکٹر بھان صاحب کا یہ پیغام ملا کہ

"آج کل شیخ صاحب کی حکومت ہے اور ہم معذور ہیں۔ محمد سلیم کو یہ ایکسرے بازار ہی سے کروانا پڑے گا۔"

میں نہیں جانتا کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ انکشاف کہ "آج کل شیخ صاحب کی حکومت ہے۔" شیخ صاحب کی حکومت کی تعریف ہے یا اس پر ایک خاموش تنقید ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا منشاء یہ ہو کہ آج کل شیخ صاحب کی

حکومت ہے اور اس حکومت میں کسی قسم کی ہیرا پھیری نہیں ہو سکتی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ شیخ صاحب یا ان کی حکومت کو محمد سلیم کے ہسپتال کی بجائے بازار سے ایکسرے کرانے میں کیا دلچسپی ہے؟ شیخ صاحب کی حکومت کیوں یہ چاہتی ہے کہ سو روپے ماہوار آمدنی والے غریب اور مفلوک الحال نوجوان ساٹھ روپے خرچ کر کے بازار سے ایکسرے کروائیں۔ اور پھر ماہانہ ساٹھ ستر روپے ادویات پر خرچ کر کے اپنی کھوئی ہوئی تندرستی بحال کریں۔ ڈاکٹر بھان کے پیغام کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شیخ صاحب کی حکومت بہت ظالم حکومت ہے اس لئے اسے اس بات کی پروا نہیں کہ محمد سلیم ساٹھ روپے خرچ کرنے کی طاقت رکھتا ہے یا نہیں۔ بہر حال ڈاکٹر صاحب کے پیغام کا جو بھی مطلب ہے اس حقیقت سے انکار کرنا ممکن نہیں کہ شیخ صاحب کی حکومت کے ساتھ ظلم بے انصافی اور بے مروتی اس طرح منسوب ہو گئی ہے کہ کچھ لوگوں کے لئے شیخ صاحب کی حکومت اور ظلم ہم معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔

☆ یہ ٹھیک ڈیڑھ ماہ پہلے کی بات ہے کہ خانیار سرینگر کی ایک خاتون ہاتھ میں پھٹے ہوئے کپڑے لئے زار و قطار روتی ہوئی میرے پاس آئی۔ اس کے چہرے پر کئی زخم تھے۔ اور اس کے مُنہ سے خون بہہ رہا تھا خاتون نے اپنی حکایت بیان کرتے ہوئے جو کچھ کہا، اس سے یہ معلوم ہوا کہ اس کے ہمسایوں نے کسی معمولی بات کا بہانہ بنا کے بُری طرح پیٹا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کی مار پیٹ کرنے والے چونکہ نیشنل کانفرنسی کھڈ پنچ ہونے کا دعویٰ

کرر ہے ہیں۔ اس لئے اسے اس بات کی توقع نہیں ہے۔ کہ پولیس والے اس کی شکایت سنیں گے یا اس پر کوئی کاروائی کریں گے۔ یہ انہی دنوں کا واقعہ ہے کہ جب نائب وزیراعلیٰ مرزا محمد افضل بیگ نے نئی دہلی میں جاری کردہ ایک بیان میں کہا تھا۔ کہ شیخ صاحب کی حکومت دوستوں اور دشمنوں کے ساتھ برابر کا سلوک کرے گی۔ میں نے بیگ صاحب کے بیان کا اعتبار کر کے ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس مسٹر شاہ کو فون کر کے انہیں مظلوم خاتون کی روداد سنائی اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں اس خاتون کو فوراً خانیار پولیس تھانے پر بھیج کر اسے وہاں شکایت درج کرنے کی ہدایت کروں۔ میں نے جب ڈی، آئی، جی صاحب سے یہ کہا کہ جن لوگوں کے خلاف اس خاتون کو شکایت ہے، اُن کا تعلق نیشنل کانفرنس سے ہے۔ تو انہوں نے ایک بڑی زور دار تقریر میں مجھ پر یہ بات واضح کر دی۔ کہ شیخ صاحب کی حکومت میں پولیس کو مکمل طور غیر جانبدار رہنے کا حکم دیا گیا ہے اور پولیس کے افسروں کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ شرپسندوں کو چاہے وہ حکمران جماعت ہی سے کیوں تعلق نہ رکھتے ہوں قانون کے شکنجے میں کس لیں۔ اس لئے اس سلسلے میں مجھے یا خاتون کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ڈی، آئی، جی صاحب نے سلسلہ کلام ختم کرنے سے پہلے یہ بھی مشورہ دیا کہ میں فریادی خاتون کو براہ راست ایس، پی سرینگر کے پاس بھیج دوں۔ اور وہ خود اس معاملے کی دیکھ بھال کریں گے۔ میں نے خاتون کو ڈی، آئی، جی صاحب کا حکم سنایا۔ ایس، پی صاحب کو فون پر ساری حکایت سنائی اور مظلوم خاتون کو ایس، پی صاحب

کے پاس تحریری شکایت لے کر بھیج دیا۔ جب سے اب تک ڈیڑھ ماہ گذر چکا ہے۔ پرسوں اتفاقاً اس خاتون سے ملاقات ہوگئی اور میں نے بر سبیل تذکرہ اس سے یہ پوچھا کہ اس کی شکایت کا کیا ہوا تھا؟ مجھے اس کا جواب سن کر حیرت نہیں ہوئی لیکن افسوس ضرور ہوا۔ اس نے مجھے بتایا، کہ میں ایس، پی صاحب سے ملی۔ انہیں درخواست دی وہ بڑے احترام سے پیش آئے۔ اور انہوں نے مجھے یقین دلایا۔ کہ میری شکایت کی تحقیقات ہوگی۔ اور جو لوگ قصوروار پائے جائیں گے۔ انہیں سزادی جائے گی۔ لیکن اس کے بعد نہ کسی نے مجھ سے کچھ پوچھا۔ اور نہ ملزموں سے باز پرس ہوئی۔ ڈی، آئی، جی صاحب کی یقین دہائی اور ایس، پی صاحب کے خلوص کے باوجود اگر بے چاری مظلوم عورت کی فریاد نہیں سنی گئی۔ تو اس میں نہ ڈی، آئی، جی صاحب کا قصور ہے اور نہ ایس پی صاحب کی خطا۔ یہ شیخ صاحب کی حکومت کی خصوصیت ہے، کہ یہاں نیشنل کانفرنس سے تعلق رکھنے والا کوئی جرم کر ہی نہیں سکتا جرم کرنے والے ہمیشہ مخالف جماعتوں سے وابستہ ہوتے ہیں!

☆

۱۹۶۷ء

یہ نہیں ہوگا!

گزشتہ ہفتہ ریاست کے درسی کتابوں کے سلسلے میں پارلیمنٹ میں جو ہنگامی ہوا اور مرکزی وزیر داخلہ نے مشتعل ایوان کو مطمئن کرنے کے لئے جو بیان دیا اس نے اہل کشمیر کی توجہ کچھ اہم مسائل کی طرف مبذول کرائی۔ معزز ممبران نے آٹھویں جماعت میں پڑھائی جانے والی کتاب ''ہماری کہانی'' کتاب کے اس باب کے خلاف احتجاج کیا، جس کا عنوان ''نیا کشمیر'' ہے انہوں نے ''نیا کشمیر'' نصاب میں شامل کئے جانے کو ملک کی خودمختاری کے منافی قرار دے کر محکمہ تعلیم حکومت کشمیر اور خواجہ غلام محمد صادق کو آڑے ہاتھوں لیا ایک معزز ممبر کی رائے میں وزیر اعلیٰ خود اس وطن دشمن سازش میں شریک ہیں حد یہ ہے کہ جب وزیر داخلہ نے ''نیا کشمیر'' کی تاریخی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہا کہ یہ دستاویز دراصل ۱۹۴۳ء میں مہاراجہ کشمیر کے قائم کردہ کمیشن کے سامنے ایک یادداشت کے طور پر پیش کی گئی تھی۔ تو ایوان میں ہندوستان کے سب سے ذی عزت شہری سردار حکم سنگھ (سپیکر) نے فتویٰ صادر کر دیا کہ ''کچھ بھی ہو ان کے خیال میں اس قسم کے دستاویزات کے

نصاب میں شامل کئے جانے سے بچوں کے ذہن پر بُرا اثر پڑتا ہے'' یہ طولاف اور طوفانی بحث اس وقت نقطہ عروج پہنچ گئی جب وزیر اعظم نے ایوان کو یقین دلایا، کہ مرکزی حکومت اس سارے واقعے کی چھان بین کرے گی۔ اس پوری بحث سے ہمارے سامنے دو اہم مسئلے پیدا ہوتے ہیں اور ان کا تعلق چوں کہ مرکز اور ریاست کے تعلقات اور ریاستی عوام کے بنیادی حقوق کی نگہداشت سے ہے اس لئے ہم ان پر وضاحت کے ساتھ کچھ کہنا چاہیں گے۔

آئین کی رو سے تعلیم ''ریاستی فہرست (State list) میں شامل ہے کئی بار یہ تجویز پیش ہوئی تھی کہ تعلیم کو مرکز کی تحویل میں دیا جائے لیکن مرکزی وزیر تعلیم مسٹر چھاگلہ کے بیان کے مطابق صرف پنجاب نے اس کے لئے رضامندی ظاہر کی تھی، دیگر ریاستوں نے بڑی سردمہری سے اس تجویز کو ٹال دیا، موجودہ پوزیشن یہ ہے کہ تعلیم پر ریاستوں کا مکمل اختیار ہے اور مرکز کو ریاست کے تعلیمی معاملات میں مداخلت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

ہماری پارلیمنٹ ایک خود مختار ادارہ ہے اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہاں ہر آدمی ہر بات کہہ سکتا ہے، چاہے وہ کہنے کی ہو یا نہیں، اس لئے ہمیں ان ممبران سے کوئی شکایت نہیں جنہوں نے ریاست کی درسی کتابوں کو موضوع بحث بنا کر اپنی شہرت اور تشہیر کا سامنا کر لیا لیکن...... وزیر اعظم اور وزیر داخلہ نے اس مسئلے کی طرف ریاستی حکومت کی توجہ مبذول کرانے کا وعدہ کرنے کی بجائے اس معاملے میں تحقیقات کرنے کی یقین دہانی کیوں کر لی؟ وہ اپنے کن اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے ''ریاستی فہرست''

کے مندرجات کے متعلق تحقیقات کر سکتے ہیں۔ یہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے، کیا اندراسرکار ریاست جموں وکشمیر کومنی پور، ہماچل پردیش اور پانڈی چری کی طرح مرکزی تحویل میں لینے کا ارادہ رکھتی ہے ہندوستان کا آئین اپنی وحدانی حیثیت کے باوجود عملاً ایک فیڈل طرز حکومت کا نگران ہے اور جب تک آئین میں ترمیم نہ کی جائے۔ ریاستوں کو اپنی اندرونی خودمختاری حاصل رہے گی ان حالات میں وزیر اعظم اور وزیر داخلہ کا رویہ قابل اعتراض ہی نہیں قابل مواخذہ ہے۔

مسئلے کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے بعض معزز ممبران پارلیمنٹ نصاب میں "نیا کشمیر" کے شامل کئے جانے پر سیخ پا کیوں ہو گئے ہیں ہم نے ایکبار پھر نیا کشمیر کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ ہمیں اس "قابل اعتراض" دستاویز میں ایک بھی ایسا لفظ نظر نہیں آیا۔ جس پر انگلی رکھ کر یہ کہا جا سکے کہ یہ قابل تعزیہ ہے......

وزیر اعلیٰ خواجہ غلام محمد صادق نے کہا ہے کہ "نیا کشمیر" ہماری آزادی کی جدوجہد کا ایک سنگ میل ہے اور یہ ان خوابوں کی نشان دہی کرتا ہے جو اہل کشمیر نے غلامی، استبداد اور مطلق العنانی کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے دیکھے تھے، وزیر اعلیٰ نے بجا طور پر کہا کہ اس تاریخی دستاویز کی بنیاد پر ہم نے ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے ساتھ الحاق کیا ہے اور اس بنیاد آج بھی یہ رشتہ قائم ہے۔ پھر ملک کے سب سے ذی عزت ایوان کے بعض ذی عزت ممبران کو "نیا کشمیر" کے ہماری درس گاہوں کے نصاب میں شامل ہونے پر اعتراض کیوں ہے؟ یہ عقدہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے

ہم معزز ممبران پارلیمنٹ کا احترام کرتے ہیں، ہمیں ملک کی سالمیت، خود مختاری اور وقار کے تئیں ان کی نازک مزاجی کا بھی احساس ہے لیکن ہم انہیں کبھی یہ حق دینے کے لئے تیار نہیں کہ وہ اپنے حقوق کا غلط استعمال کر کے دوسروں کے حقوق پامال کرنے کی سعی کریں، بہت سے معزز ممبران نے اپنے غیض وغضب کا اظہار کرنے سے پہلے ''نیا کشمیر'' کا مسودہ ایک بار بھی نہ پڑھا ہوگا۔ اور جن حضرات نے اسے پڑھ کر اپنے غم وغصے کی نمائش کی ہے ان کی خدمت میں ہم یہ عرض کریں گے کہ ایک پارلیمنٹ کیا، ایسی ہزاروں پارلیمنٹیں بھی تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکتیں ہیں، ظلم واستبدادم مطلق العنانیت اور استحصال کے خلاف ہماری جدوجہد تاریخ کے سینے میں محفوظ ہے۔ اسے نصاب کی کتابوں میں درج کرنے قابل اعتراض قرار دینے اور ذہنوں سے سمو کرنے کی ہر سازش کا انجام وہی ہوگا جو اس قسم کی سازشوں کا مقدر رہوتا ہے۔ انیس سال پہلے ہم نے پاکستان کو اس لئے پائے حقارت سے ٹھکرادیا تھا کہ وہاں ''نیا کشمیر'' کے خوابوں کی تعبیر ممکن نہ ہوسکتی تھی ہم نے اس اُمید پر ہندوستان کا دامن تھاما کہ یہاں ''نیا کشمیر'' اصولوں اور آدرشوں پر ہمیں اپنا مستقبل تعمیر کرنے کی آزادی ہوگی۔ ۱۹ سال کے بعد ہندوستان کے سب سے بڑے ایوان میں اس دستاویز کو قابل اعتراض اور قابل تعزیر قرار دیا جائے تو ریاستی عوام پر اس کے ردعمل کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ ہندوستان کے ساتھ ہمارا الحاق ایک جغرافیائی تعلق ہی نہیں ایک تاریخی تسلسل اور نظریاتی ہم آہنگی کا عنوان بھی ہے اور جو لوگ

طاقت اور اقتدار کے نشے میں بدمست ہو کر کشمیر کو اپنی جاگیر سمجھ رہے ہیں، ہم ان پر یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ ہندوستان اور کشمیر کے بنیادی تعلق ......نظریاتی ہم آہنگی کی جڑیں کاٹ رہے ہیں ان کا ہر قدم غلط رستے پر پڑ رہا ہے وہ کشمیر کو ہندوستان سے دور کرنے کے ناقابل معافی جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں، شری کانتی رام گپتا، سردار حکم سنگھ، پرکاش ویر شاستری اور بھگوت جھا کو کیا معلوم کہ ''نیا کشمیر'' کس جانور کا نام ہے انہوں نے تو صرف ایک دستاویز کے روپ میں اس کا تذکرہ سنا ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ ''نیا کشمیر'' کے لئے کتنی ماؤں نے اپنے لخت جگر، کتنی دلہنوں نے اپنا سہاگ اور کتنے نوجوانوں نے اپنا لہو قربان کر دیا ہے آج شری نندہ اسے ایک متروک تاریخی دستاویز قرار دے کر نظر انداز کر دیں تو ہندوستان اور کشمیر کے درمیان کوئی قدر ہی مشترک ہی باقی نہیں رہتی ہم بخوبی سمجھتے ہیں کہ پارلیمنٹ کا ہنگامہ دراصل اس تنگ نظری، ہنگامہ پرور تربیت کا نجار ہے، جس نے اسی ملک کی توانائی اور قوت کو گھن لگا دیا ہے ہم جانتے ہیں کہ آج کل اکثر ممبروں کی نظریں آئندہ انتخابات پر جمی ہوئی ہیں اور وہ اپنی ہر ادا سے ''رائے عامہ'' کو متاثر کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ہم مرکزی حکومت کے سربراہوں پر یہ واضح کر دینا چاہیں گے کہ ریاستی عوام اس جنگ زرگری سے مرعوب ہو کر اپنے حقوق سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں، ہندوستان کا ایک حصہ ہونے کے ناطے ہمیں کچھ حقوق اور مراعات حاصل ہیں اور اگر ہماری موجودہ قیادت نے گیدڑ بھبکیوں سے ڈر کر ہماری تاریخ کو مسخ کرنے، اس میں

تحریف کرنے یا اسے مصلحتوں کی نذر کرنے کی کوئی کوشش کی تو ہم اس قیادت کے خلاف بغاوت کر کے اس کا تختہ اُلٹ دیں گے۔ ہمیں خوشی ہے کہ وزیراعلیٰ خواجہ غلام محمد صادق نے بڑی جرأت اور صفائی کے ساتھ ریاستی حکومت کا موقف واضح کیا ہے ہمیں اُمید ہے کہ مرکزی سرکار ریاستی عوام کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے آئندہ ہماری اندرونی معاملات میں غیر ضروری مداخلت نہیں کرے گی ۔ مرکزی سرکار بعض ہنگامہ پسندوں کے احتجاج کے باوجود ان ناگا لیڈروں سے بات چیت کرتے میں کوئی تامل نہیں کرتی ، جو ہر روز اپنی تخریبی کاروائی سے کئی جانیں ضائع کرتے ہیں جنہوں نے باقاعدہ ایک فیڈرل حکومت قائم کی ہے اور جو اس فیڈرل حکومت کے نمائندے سے لے کر وزیراعظم سے بات چیت کرنے کے لئے دہلی آتے ہیں سردار حکم سنگھ ، پرکاش ویر شاستری ، مٹر ہیم بروا اور شری کاشی رام گپتا یہ سب کچھ برداشت کر سکتے ہیں لیکن کشمیر کی درسی کتابوں میں یہاں کے عوام کی جدوجہد آزادی اور ان کی تمناؤں کا ذکر گوارا نہیں کر سکتے ، صادق صاحب نے صاف طور پر کہا ہے کہ ہم تاریخ کو مسخ کرنے یا واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے اسی لئے ہماری درسی کتابوں میں امریکہ کی جنگ آزادی کے ساتھ ساتھ چین کے انقلاب کا بھی ذکر ہونا چاہیے ۔ ہماری نئی نسل ہمارے بعض ممبران پارلیمنٹ کی طرح جاہل نہیں رہ سکتی اور جہالت کو قومیت کا معیار بنانے کی ہر کوشش کو ناکام بنانا چاہیے بعض ممبروں نے اس بات پر اعتراض کیا ہے کہ تاریخ کی ایک کتاب میں سکھوں

کے ظلم وستم کا ذکر ہوا ہے دوسرے صاحب نے کہا کہ ایک درسی کتاب میں سُرخ چین کی تعریف کی گئی ہے یہ دونوں حقیقتیں اپنی جگہ اٹل ہیں سکھوں کا دور حکومت پٹھانوں کے دور حکومت کی طرح کشمیر کی تاریخ کا سیاہ ترین باب ہے اس دور میں کشمیر پر اتنے مظالم توڑے گئے ہیں کہ ان کے تذکرے سے آج بھی روح کانپنے لگتی ہے کیا ہم سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ ہم اپنے بچوں کو یہ بتائیں کہ سکھوں کا دور حکومت کشمیر کی تاریخ کا سنہری باب ہے یہ تعلیم نہیں حقائق کی تکذیب ہوگی، اس طرح ''سرخ چین'' کا انقلاب اس صدی کا سب سے اہم ناقابل فراموش اور تاریخی واقعہ ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ چینی حکمرانوں کے بے اعتدالیوں کا انتقام لینے کے لئے ہم اپنی نئی نسل کو اس اہم انقلاب سے بے خبر رکھیں؟ ایسا کر کے ہم چینی لیڈروں سے نہیں اپنے نوجوانوں سے انتقام لیں گے، جو تنگ نظری اور مریض قوم پرستی کے ماحول میں پرورش پاکر اپنے گردوپیش کی دنیا سے بالکل ناواقف ہونگے ہم ایک بار پھر معزز ممبران پارلیمنٹ کو یہ مشورہ دیں گے کہ وہ ''نیا کشمیر'' کا مسودہ ایک نظر دیکھ لیں الفاظ کے تاثرات کی بجائے اس خاکے کی اصل کو سمجھنے کی کوشش کریں تو انہیں اس بات کا اطمینان ہوگا کہ

وہ بات جس کا کہ سارے فسانے میں ذکر نہیں
وہ بات ان کو بہت ناگوار گذری ہے

☆

۲/اپریل ۱۹۷۷ء

بخشی صاحب (مرحوم) کا خط

شیر کشمیر کے نام

محترم شیر کشمیر!

یہ آٹھ دس دن قبل کی بات ہے کہ خانقاہ معلیٰ میں میری قبر کے باہر پٹاخوں کی آواز نعروں کی گونج اور شور وغل کے ہنگامے سے میری آنکھ کھل گئی اور جب میں نے داروغۂ جنت سے یہ دریافت کیا کہ یہ کیا ماجرا ہے تو اس نے مجھے یہ مژدۂ جان فزا سنایا کہ بیگم صاحبہ نے سوا لاکھ ووٹوں کے فرق سے سرینگر کی پارلیمانی نشست جیتی ہے اور اب شہر کے لوگ ان کی کامیابی کا جشن منا رہے ہیں، میں نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ آپ کو اس بے نظیر کامیابی پر مبارکبادی کا خط لکھوں۔ لیکن دوسرے دن جب میں خط لکھنے بیٹھا تو جنت کے محکمہ اطلاعات کے اعلیٰ آفیسر نے یہ خبر دی کہ بیگم صاحبہ کی کامیابی کے رنگ میں کچھ بھنگ ڈالنے والے شر پسند عناصر نے شہر میں فساد بپا کر دیا ہے اور پولیس بے تحاشا لاٹھیوں اور ٹیر گیس کا استعمال کر رہی ہے۔ یہ خبر سن کر میری دلچسپی بڑھ گئی اور میں نے جنت کے محکمہ سراغرسانی کی ان تمام رپورٹوں کا مطالعہ کیا کہ جن کا تعلق فروری ۱۹۷۵ء سے مارچ ۱۹۷۷ء تک

ہے اس مطالعے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ مجھے آپ کو صرف بیگم صاحبہ کی کامیابی پر ہی نہیں اور بھی بہت سی باتوں پر مبارکباد دینا ہوگی۔ اس لئے قلم دوات لے کر بیٹھ گیا ہوں کہ جو دل میں ہے، اسے ضبط تحریری میں لا کر آپ کے نام ارسال کر دوں......!

میرے رہنما! بیگم صاحبہ کی کامیابی تو بہر حال قابلِ مبارک باد ہے ہی، لیکن یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی ہے کہ آپ نے بیگم صاحبہ کی کامیابی کو یقینی اور عظیم الشان بنانے کے لئے جو نسخے استعمال کئے ہیں، ان میں نہ صرف میرے آزمائے ہوئے نسخے ہیں بلکہ کچھ ایسی بھی جدتیں ہیں کہ جن کے بارے میں، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کبھی کبھی میرا ضمیر مجھے ملامت کیا کرتا تھا کہ میں نے انتخابات جیتنے کے لئے ایسے طریقے کیوں استعمال کئے کہ جنہیں اس دور کی جمہوری لغت میں غیر جمہوری کہا جاتا ہے۔ لیکن بیگم صاحبہ کی الیکشن فائل دیکھ کر مجھے یہ اطمینان ہو گیا کہ آپ میرے مقابلے میں ہر اعتبار سے عظیم ہیں۔ آج میری روح کو سکون سا حاصل ہوا ہے کہ اگر آپ جیسے عظیم رہنما کو بیگم صاحبہ جیسی محترم خاتون کو انتخاب جتانے کے لئے ایسے ایسے نادر نسخے آزمانے پڑے تو میں نے بھی اگر غریب صوفی یا مصالحہ کو جتانے کے لئے کچھ داؤ پیچ لڑائے، تو کیا مضائقہ ہے؟ آپ نے سرینگر کے پارلیمانی انتخابات میں اپنی کارکردگی سے میرے گناہوں کی سیاہی بہت حد تک دھو دی ہے۔ اس کے لئے آپ کا شکریہ، قائد اعظم! آپ کے دو سالہ دور اقتدار میں آپ نے اتنے کارنامے انجام دئے ہیں کہ میں چاہتا ہوں

کہ ایک ایک کارنامے پر آپ کو دلی مبارکباد دوں، میرے پاس تو بہت وقت ہے۔ لیکن آپ بہت مصروف ہیں اور آپ کا وقت بہت قیمتی ہے۔ اس لئے مختصراً تشکر اور تہنیت کے وہ جذبات آپ تک پہنچانا چاہتا ہوں کہ جو میرے دل میں موجزن ہیں مجھے سب سے پہلے یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی، کہ آپ نے ۲۲ سال کی تاخیر کے بعد ہندوستان سے کشمیر کے الحاق کی حقیقت کو تسلیم کر کے ۲۵ فروری ۱۹۷۵ء کو ان ہی کانگریسیوں سے اقتدار کی چابی حاصل کر لی، کہ جن کو آپ نالی کے کیڑے کہہ کر یاد کیا کرتے تھے۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ جو حقیقت غلام رسول کار، ایوب خان اور غلام نبی سوگامی کی سمجھ میں ۲۲ برس پہلے آ گئی اسے سمجھنے میں آپ کو آپ کے دوسرے رفیقوں کو پورے بائیس برس لگے۔ بہر حال دیر آید درست آید، مجھے اُمید ہے کہ آپ اب اس نئے ایمان پر کچھ دنوں کے لئے کاربند رہیں گے۔ معلوم ہوا کہ اقتدار سنبھالنے سے پہلے آپ نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ جب تک ۱۹۵۳ء سے پہلے کی صورت حال بحال نہیں کی جاتی۔ آپ کسی مفاہمت پر رضا مند نہیں ہوں گے۔ لیکن بعد میں آپ نے مصلحت وقت کو مدنظر رکھ کر وہی قبول کیا، کہ جو آپ کو دیا گیا۔ میں نے جنت کے ڈائریکٹر ریکارڈس سے خصوصی طور اس مفاہمت اور اس معاہدے کی کاپی حاصل کی ہے کہ جو آپ کے اور مسز اندرا گاندھی کے درمیان طے پایا ہے۔ یہ جان کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی کہ آپ کو ۱۹۵۳ء سے پہلے کی تو بات ہی نہیں، وہ کچھ بھی نہیں ملا ہے کہ جو مجھے حاصل تھا، سوچتا ہوں کہ اس کی مبارک باد آپ کو دوں

یا اندرا گاندھی کو۔

محترم شیخ صاحب! گذشتہ بائیس برسوں میں آپ اکثر مجھ پر یہ الزام لگایا کرتے تھے، کہ میں کنبہ پرور ہوں۔ اور میں نے اپنے بھائی بندوں کو بے حساب دولت کمانے کے مواقع فراہم کئے ہیں۔ مجھے اس بات کا اعتراف کرنے دیجئے، کہ میرے کچھ بھائیوں اور عزیزوں نے واقعی میرے منصب کا ناجائز فائدہ اُٹھا کر مکان بنائے اور جائیداد اکٹھی کی۔ مجھے اس بات کا بھی احساس ہے کہ میں اپنے بھائیوں اور رشتہ داروں کی خرمستیوں سے اتنا بدنام ہو گیا کہ بہت سے لوگوں نے مجھے مرتے دم تک معاف نہیں کیا۔ لیکن آپ کی فائل دیکھ کر میرے ان زخموں پر بھی مرہم لگ گیا اور جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ آپ نے اقتدار سنبھالنے کے چند ہی ہفتوں بعد طارق صاحب کو دو ہزار روپے تنخواہ دے کر ٹورسٹ کارپوریشن کا مینجنگ ڈائریکٹر بنا دیا تو میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ پھر جب یہ معلوم ہوا کہ آپ نے غلام محمد شاہ کو وزیر بنا کر اسے سپلائز کا محکمہ سونپ دیا ہے تو میرے دل کو وہ روحانی سکون حاصل ہوا کہ جس کی تلاش اسے برسوں سے تھی۔ فائل کے مطالعے کے بعد گپکار روڑ پر آپ کی تعمیرات اور دھن جی بھائی کی عمارت پر آپ کے دست شفقت کا احوال پڑھ کر طبیعت بے حد خوش ہوئی۔ یہ جان کر بھی دلی مسرت ہوئی، کہ زینہ کدل میں آپ کے سمبندھی متو صاحبان نے بھی بہتی گنگا میں اشنان کر کے میرے عزیز و اقارب کے کارنامے بھلا دیئے ہیں۔ کہیں برادرم محی الدین متو پر حملے کا بھی کچھ احوال درج تھا۔ لیکن کچھ زیادہ نہیں۔

ان سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی سرگرمیاں بلاخوف وخطر جاری رکھیں۔ خانقاہ معلیٰ کے علاقے میں بہت سے سرپھرے موجود ہیں۔ ان کی وقتاً فوقتاً مرمت ہونی چاہیئے۔ یہ وہی لوگ ہیں کہ جنہوں نے میری لاش کو میری قبر سے نکالنے کی دھمکی دی تھی، ان کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا، کم ہے۔

شیر کشمیر! سوچتا ہوں کہ آپ کے کس کس کارنامے پر آپ کو مبارکباد دوں پچھلے دو سال کے دوران آپ نے جتنے بھی کام کئے ہیں۔ ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کشمیر کے لوگ جو زندگی بھر مجھے گالیاں دیتے رہے اب مجھے بے تحاشا دعائیں دے رہے ہوں گے، اس سلسلے میں خاص طور آپ کے سبسڈی والے کارنامے پر آپ کو مبارکباد دینا چاہتا ہوں۔ آپ اور آپ کے رفیق مرزا بیگ اکثر مجھے یہ طعنہ دیا کرتے تھے کہ میں نے کشمیریوں کو سستے چاول کھلا کر ان کو بزدل اور بے عزت بنا دیا تھا۔ خدا گواہ ہے کہ سستے چاول کھلا کر میرا مقصد انہیں بزدل اور بے غیرت بنانا نہیں تھا۔ ان غریبوں کو زندہ رہنے کا وسیلہ مہیا کرنا تھا کہ جن کے لئے اپنی محدود آمدن میں گذارہ کرنا مشکل تھا۔ مجھے اس جرم کا اقبال ہے کہ میں نے غریبوں کو سستا راشن مہیا کرنے پر بھاری رقومات صرف کیں اور اگر مجھے آج بھی موقع ملے، تو میں یہ جرم بار بار کروں گا۔ حالانکہ جن لوگوں کو میں نے سستے چاول کھلا کر بقول آپ کے انہیں بزدل اور بے غیرت بنا دیا تھا وہی لوگ میرے سب سے زیادہ مخالف تھے اور انہیں لوگوں نے اپنی جرأت اور غیرت کا مظاہرہ کر کے مجھے ۱۹۷۱ء کے انتخاب میں شکست دی تھی اب آپ نے

سبسڈی ختم کر کے انہیں مہنگے داموں راشن کھلانا شروع کیا ہے تو مجھے اُمید ہے کہ وہ زیادہ بہادر اور باغیرت بھی بن گئے ہوں گے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ اب کھلے بندوں، شہر کی شاہراہوں پر آپ کی تصویروں کی بے حرمتی کرنے لگے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ ان کی اس بہادری پر ان سے ناراض ہونے کی بجائے ان کی جراٴت اور غیرت کی داد دیں گے، کیونکہ مہنگا راشن کھانے سے ذہنوں میں انقلاب کی چنگاریاں روشن ہونا فطری بات ہے۔ یہ الگ سوال ہے کہ زمینی جنت سے اس آسمانی جنت میں برابر یہ اطلاعات موصول ہورہی ہیں کہ بہت سے لوگ راشن خریدنے کے لئے اپنی بہنوں اور بیٹیوں کی عزت اور غیرت بیچنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔لیکن آپ اس کی فکر نہ کیجئے کیونکہ سوال قوم کی عزت وآبرو کا نہیں، آپ کی عزت وآبرو کا ہے اور یہ عزت وآبرو اگر قوم کی عزت وآبرو بیچ کر بھی حاصل ہوجائے تو کوئی مضایقہ نہیں،

قائد اعظم! خط طویل ہوتا جارہا ہے لیکن آپ کے ایک کارنامے کے لئے آپ کا شکریہ ادا کئے بغیر یہ خط ختم کرنے کو جی نہیں چاہتا۔آپ کو یاد ہوگا کہ میرے ایک چچیرے بھائی رشید نے اپنی رعونت اور جہالت سے صرف لوگوں کا ہی نہیں، میرا بھی ناک میں دم کردیا تھا۔اس کے نام سے لوگ خوف کھاتے تھے اور نیشنل کانفرنس کے جنزل سیکرٹری کی حیثیت سے اس نے شہر اور دیہات میں وہ دہشت پھیلادی تھی کہ میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی بے بس ہوگیا تھا۔ بخشی رشید کی خرمستیوں کی مجھے بہت بڑی قیمت چکانا

اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ دو سال قبل تک لوگ بخشی رشید کا نام لے کر مجھے گالیاں دے رہے تھے۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے اپنے چہیتے داماد غلام محمد شاہ کو وزیر بنا کر اور تنظیم میں مسلط کر کے لوگوں کے دلوں سے بخشی رشید کی یاد محو کر دی ہے اور جنت ارضی سے موصول ہونے والی اطلاعات سے اندازہ ہوتا ہے، کہ شاہ صاحب اپنے کارہائے نمایاں سے لوگوں کو اس درجہ محظوظ فرما رہے ہیں کہ بہت جلد لوگ بخشی رشید کو فرشتہ سمجھنے لگیں گے۔ معلوم ہوا ہے کہ ایک بدنام انسان کو ایک فرشتہ بنانے کے عمل میں شاہ صاحب کے برادر غلام محی الدین شاہ اور آپ کے بھانجے شیخ عبدالرشید ان کے برابر کے شریک ہیں۔

خط طویل ہوگیا، ابھی بہت سی باتیں کرنا ہیں اس وقت اجازت دیجیے، پھر کبھی سمع خراشی کروں گا۔

فقط آپ کا خیر اندیش
بخشی غلام محمد

☆

''احمد آباد کے فسادات نے کچھ اہم سوالات کو جنم دیا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ ہم سنجیدگی سے ان سوالات کا جواب دینے کی کوشش کریں۔

سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اگر بائیس برس کے بعد بھی ہندوستان میں مسلمان اپنے جان و مال کو محفوظ نہیں سمجھتا، تو اُس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ ہندوستان کو اپنا محبوب وطن تصور کرے، کیونکر ممکن ہوسکتا ہے؟

اگر اتنی بڑی فوج اور پولیس کے ہوتے ہوئے چند دنوں کے اندر اندر ہزاروں بے گناہ برسرِ بازار قتل کر دئے جاتے ہیں۔ تو حکومت اور انتظامیہ کی غیر جانبداری اور ایمانداری پر بھروسہ کیوں کر لیا جاسکتا ہے؟

اور ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ ان شرمناک واقعات کا کشمیر پر ذہنی اور نفسیاتی طور پر کیا اثر ہوگا؟''

نومبر 1969

QUAF PRINTERS
Ph : 9419055644